سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان ذخیرہ جسکا نام سیرۃ النبی تو عام طور سے مشہور ہے مسلمانون کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت اہتمام کیساتھ مرتب کیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہین، پہلے مین ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جسمیں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق وعادات، اعمال وعبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے تیسرے حصہ میں آپکے معجزات وخصائص نبوت پر بحث ہے، اسمیں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید وتفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانون کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل وتشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے، اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اوّل تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلان ستے، تقطیع خورد صہ دیے، حصہ سوم تقطیع کلان سے، للعہ، تقطیع خورد معہ وصہ، حصہ چہارم تقطیع کلان معے، روسے، تقطیع خورد معہ وصہ، حصہ پنجم تقطیع کلان صہ، للعہ

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

عدد ۴	ماہ شعبان المعظم سنہ ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء	جلد ۴۲

مضامین

شذرات

حاتم یوپی کی وفات،

ہمارے صوبہ کے حاتم نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر نے ستمبر کی آخری تاریخوں میں اپنے وطن بھیکم پور ضلع علیگڈہ میں وفات پائی، مرحوم کئی سال سے لگاتار بیمار تھے، بخار اور کھانسی کی تکلیف تھی، ضعف کبھی بڑھ جاتا، کبھی گھٹ جاتا، اور آخر اتنا بڑھا کہ پھر نہ گھٹا، چوہتر برس کی عمر میں دنیا کے ہر اُتار چڑھاؤ کو دیکھکر اور ہر سرد و گرم کو آزما کر دین و دنیا دونوں کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہوکر ۲ ستمبر ۱۹۳۸ء کو اس ہری بھری دنیا کو الوداع کہا،

مرحوم شروانی خاندان کے چشم و چراغ تھے، اور جیسا کہ وہ فرمایا کرتے تھے، سر سید کی گودوں میں کھیل کر جوان ہوئے تھے، عربی و فارسی کی تعلیم پائی تھی، اور انگریزی اتنی جانتے تھے کہ اخبار پڑھ اور گفتگو سمجھ لیتے تھے، فارسی کے شاعر تھے، مرزا سنجر طہرانی سے اصلاحیں لی تھیں، فارسی کا پورا دیوان مرتب تھا، انکی غزلیں اور نظمیں کئی دفعہ انکی زبان سے سنیں اور شاید ایک دو دفعہ معارف میں بھی چھپیں، تقریر شگفتہ اور پر مذاق کرتے تھے،

مولنا شبلی مرحوم کے دوستوں میں تھے، اسی کا اثر یہ تھا کہ وہ مولنا کے کاموں اور تحریکوں سے دلچسپی رکھتے تھے، ندوہ کی طرف ان کا التفات مولنا ہی کے دم قدم اور قلم کے اشاروں سے ہوا، اور دار المصنفین کی طرف انکی چشم کرم بھی اسی نسبت کی مرہون ہے، دار المصنفین اپنی چوبیس برس کی عمر میں حیدر آباد و بھوپال کی سرکاروں کے علاوہ اگر کسی محسن کے فیض سے مستفید ہوا ہے تو وہ بھیکم پور کے رئیس کی ذات تھی، مرحوم نے دار المصنفین کی مسجد

پانچہزار کے خرچ سے بنوائی، اور اس کے لئے دری کا فرش اور پردے بنوا کر بھیجے،

علیگڈہ کالج ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم یونیورسٹی، اسلامیہ اسکول اٹاوہ، الہ آباد یونیورسٹی، ہندو یونیورسٹی، دار العلوم ندوۃ العلماء، دار العلوم دیوبند، غرض اس صوبہ کا کوئی علمی و تعلیمی ادارہ ایسا نہیں جو انکے چشمۂ فیض سے سیراب نہیں، بلکہ سنکر حیرت ہوگی کہ جمعیۃ العلماء اور کانگریس تک ان کے خوانِ نعمت سے مستفید تھے، وہ ہر قوم اور ہر فرقہ کے نیک کاموں کی امداد میں حصہ لیتے تھے، مسلمان، ہندو، عیسائی، پارسی کی کوئی تخصیص نہ تھی، غرض جو آیا وہ اپنے نصیب کا حصہ پا گیا،

ہر کجا چشمۂ بود شیریں
مردم و مور و مرغ گرد آیند

مرحوم اپنی ذاتی دولتمندی کے باوجود بیحد، سادہ زندگی بسر کرتے تھے، ایک دفعہ انھوں نے اپنے ململ کے کرتے کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ تین آنے گز کا ہے، اور یہی ڈگانوں کا بنا ہوا ہے، لیکن اس ذاتی کفایت شعاری سے بچایا ہوا سرمایہ بے تکلف سال دو سال مین قوم اور ملک کے کسی کام کے نذر کردیتے تھے، وہ اکثر ایسے موقع پر یہ شعر پڑھا کرتے تھے،

نہ کس می دہاند نہ کس می دہد
خدا می دہاند خدا می دہد

مرحوم سے آخری ملاقات پچھلے جاڑوں میں بھیکم پور میں ہوئی، وہ خود بھی اپنی زندگی سے مایوس تھے اور ایسی ہی کلمات اُن کی زبان پر تھے، دیر تک حج کے واقعات اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے حالات بیان فرماتے رہے، زندگی کے اختتام اور کسی نیک عمل کے قبول کی حسرت ظاہر کی، میں نے تسلی دی کہ حاتم کی بیٹی دربارِ رسالت میں اپنے باپ کی فیاضی کی بدولت عزت کی مستحق ٹھہری، پھر کوئی سبب نہیں کہ آپ کی تمام عمر کی فیاضی کے کام دربار الٰہی میں قبولیت کے مستحق نہ ٹھہریں،

افسوس کہ ہمارے صوبہ کا یہ حاتم ہم سے رخصت ہوگیا، ہر نیک تحریک کا مددگار رہا، ہر اچھے کاموں کا رہبر ہر ضرورت پر ہر ایک کے کام آنے والا جاتا رہا، خداوند رحیم و کریم کی بارگاہِ بے نیاز میں دعا ہے کہ وہ مرحوم کے اعمال نیک کو قبول فرما کر اس کو اپنی مغفرت کی دولت سے مالا مال کرے، اور مرحوم کے خورد سال جانشین کو عمر و اقبال اور توفیقِ خیر سے بہرہ مند فرمائے،

۱-۲-۳- اکتوبر کو پٹنہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بڑی دھوم دھام سے ہوا، کانفرنس اپنی اکاون سال کی عمر میں پٹنہ میں یہ پہلی دفعہ ہوئی، اور حق یہ ہے کہ یہ ساری کامیابی ایک محترم خاتون کے سبب ہوئی، اور حافظ کا وہ مصرع جس میں اکبر نے حسب زمانہ اصلاح دی،

زنے از پردہ بروں آید و کارے بکند

اتنے دنوں کے بعد حرف حرف پورا اترا،

کانفرنس میں مہمان بھی آئے تھے، نمائندے بھی تھے، تجویزیں بھی پیش ہوئیں، آنریبل فضل حق کا خطبۂ صدارت بھی بہت سے اچھے خیالات کا حامل تھا، محترمہ لیڈی انیس امام کا استقبالی خطبہ بھی دلچسپ تھا، گفتگو میں ہماہمی، اور رد و کد میں سرگرمی بھی پوری تھی، مگر اس عطر کی زمین تعلیم کے بجائے سیاست تھی، اور وہ بھی وہ سیاست جس میں عاقبت اندیشی کی جگہ صرف جذبات کی نمائش ہو،

مسلمان ایسے دور سے گذر رہے ہیں جب ایک طرف ایک متفقہ پروگرام، اور سالہا سال کی سوچی ہوئی تجویزیں ہیں، اور دوسری طرف ہنگامی تجاویز، پراگندہ خیالات، اور تعمیر ملت کے بجائے صرف ذاتی [illegible] کی دھن ہو، یہ الفاظ نہایت ہی درد و کرب کے ساتھ قلم سے نکل رہے ہیں، دل چاہتا ہے کہ پورا مسلم ہندوستان یکجا پہلے اپنا تعلیمی مقصد متعین کرتا، پھر اس پر اپنی ملت کی تعمیر کرتا، ع

مسلم خوابیدہ اُٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو،

مقالات

مسلمانوں کی آیندہ تعلیم

"آج سے پانچ سال پہلے ۱۱ اپریل ۱۹۳۳ء کو اس موضوع پر جامعۂ دہلی میں میں نے یہ مقالہ پڑھا تھا، اور اس وقت عام طور سے یہ چھپا تھا، مگر اس کو بہت جلد بھلا دیا گیا' آج جبکہ ہندوستان کی سیاسی دنیا نے نئی کروٹ لی ہے، اور تعلیم کا نیا خاکہ ہمارے سامنے رکھا گیا ہے، ضرورت ہے کہ ہم اس کو دوبارہ پڑھیں، اور ممکن ہو تو اس کی روشنی میں ہم اپنی تعلیمی مشکلات کے حل کی راہ ڈھونڈھیں،

اس مقالہ کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ آج جو کچھ پیش آیا ہے وہ کل غور کرنے والوں کے سامنے تھا، اور آواز دینے والا آواز دے چکا تھا کہ برسات آنے سے پہلے بارش اور سیلاب سے بچنے کی تدبیر سوچ لیجائے،

آیندہ اس پر مزید خیالات پیش کرنے کا ارادہ ہے،

"س" ۲۳؍اگست ۱۹۳۸ء

دوستان و عزیزانِ جامعہ! آج سے آدھی صدی پہلے مولنا شبلی مرحوم نے علی گڈہ ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسے میں "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" پر ایک مضمون پڑھا تھا، جو نہایت مقبول ہوا

تھا، اب آدھی صدی کے بعد ضرورت ہے کہ مسلمانوں کی آیندہ تعلیم کے مسئلہ پر غور کیا جائے،

اسی زمانے میں سرسید مرحوم نے مسلمانوں کے انحطاط کا سبب اور اس کا علاج مسلمانوں کے اہل دماغ طبقے سے پوچھا تھا، بہت سے صاحبوں نے اس کا سبب جہالت اور اس کا علاج "تعلیم جدید" کو قرار دیا تھا، چنانچہ نصف صدی تک ہم نے اس فیصلے پر آنکھ بند کرکے عمل کیا اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہے، اب نصف صدی کے بعد پھر اس سوال کی ضرورت ہے کہ ہم کو کس قسم کی جدید تعلیم چاہئے، ان پچاس برسوں میں ہم نے صرف تعلیم تعلیم پکارا ہے، اور ایک منٹ کے لئے بھی اس پر غور نہیں کیا ہے کہ کیسی تعلیم؟

ترک موالات کی پچھلی تحریک پہلا موقع تھا جس میں مسلمان نادانستہ طور سے اچانک اُس موڑ پر پہنچ گئے جہاں ان کو اس کا فیصلہ ضروری ہوگیا، ورنہ ہلاکت کا عمیق غار ان کے پاؤں کے نیچے تھا،

اب یہ کوئی چھپا راز نہیں کہ تعلیم کے مسئلے پچاس برس پہلے کے مقابلے میں اب بالکل اور نظر سے دیکھے جاتے ہیں، پہلے جدید تعلیم کی ضرورت کا سب سے بڑا سبب سرکاری نوکریاں تھیں اور یہ یقین تھا کہ سرکاری نوکریوں کا دروازہ اسی کنجی سے کھلیگا، لیکن اب یہ مسئلہ اس صورت کے بجائے اس صورت میں ہے کہ نئی تعلیم کی ضرورت اس لئے ہے کہ "پیٹ" کا سوال اسی سے حل ہوگا، پچاس برس کے بعد مولانا حالی کا یہ طعنہ واقعہ کی شکل میں ہمارے سامنے آگیا

: نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر   وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

مسلمانوں میں جدید تعلیم کی اوسط ہر سال آگے بڑھ رہی ہے، آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ سے مولانا شبلی نے اپنے وطن کے دوستوں کو مبارکباد بھیجی تھی کہ

"اب کی پٹنہ محمڈن اسکول سے جو خاص مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، آٹھ لڑکے انٹرنس

میں پاس ہوئے، جن میں پانچ مسلمان ہیں" (مکاتیب اول صفحہ ۳ طبع دوم)

اور اب یہ حال ہے کہ ہر سال انٹرنس اور میٹرک کیا، اس سے دہ چند گریجویٹ ہو رہے ہیں، تاہم اب کیا مسلمانوں کا انحطاط کم ہوگیا اور وہ اب ترقی کر رہے ہیں؟ مولانا شبلی مرحوم جب مولویوں کے مدرسوں کو چھوڑ کر علی گڑھ کالج آئے تھے، تو وہاں کے طلبہ کو دیکھ کر حسب ذیل فقرے لکھے تھے

"یہاں آکر میرے خیالات مضبوط ہوگئے، معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر نہیں آتا، بس خالی کوٹ پتلون کی تماشاگاہ ہے، ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمامتر ضعیف ثابت کردیں گے لاحول ولا، وہ غریب تو زمین کی حرکت بھی سمجھ نہیں سکتے،

"سید صاحب (سرسید) نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے صرف تین شخصوں کو مستثنیٰ کرتے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی نہیں پیدا کرتی"

یہ خط ۱۸۸۳ء کا ہے جس کو اب پورے پچاس برس ہوئے، کیا تھوڑے تغیر کے ساتھ مسلمانوں کی جدید تعلیمی کیفیت یہی نہیں ہے؟ اصل یہ ہے کہ ہم نے جب جدید تعلیم کی اشاعت کا کام شروع کیا تو یہ سمجھے کہ نفس اے، بی، سی، ڈی ہماری کامیابیوں کے خزانے کی وہ کنجی ہے جو کبھی الف لیلہ کے علی بابا کو ہاتھ آگئی تھی،

اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں ہم کو تعلیم کی حقیقت پر ایک لمحہ غور کرنا چاہئے،

تعلیم تعلیم کے لفظی معنی سکھانے کے ہیں، اور ہم اپنی زبان میں اس کے معنی سیکھنے سکھانے کے لیتے ہیں اور اس سے مراد پڑھنے اور لکھنے کا فن سیکھنا ہے اور آج کل اس کے معنی اس سے بھی زیادہ محدود ہیں، یعنی انگریزی زبان میں لکھنے اور پڑھنے کو ہم تعلیم کہتے ہیں، ہم نے اب تک بار بار جب تعلیم کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے مراد وہ سرکاری تعلیم ہی ہے جو عام یونیورسٹیوں کے ماتحت دی جاتی ہے، دوسرے معنوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ لکھنے اور پڑھنے کا وہ ہنر یا پیشہ جو سرکاری نظام کے ماتحت سکھایا جاتا ہے،

سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرنا چاہئے کہ کسی زبان کے چند حروف کو لکھنا اور ان کو پڑھ لینا اسی طرح کا ایک ہنر یا پیشہ ہے جس طرح نجاری، لوہاری، معماری اور دنیا کے اور پیشے ہیں، اگر کوئی اس حرف شناسی کے ہنر یا پیشے سے ناواقف ہے تو وہ اسی طرح مورد الزام ہو سکتا ہے جس طرح اس بات پر کہ وہ نجاری یا لوہاری یا معماری کا کام کیوں نہیں جانتا موجودہ عہد سے پہلے کبھی کسی قوم کی ترقی اور تنزل کے مسئلے میں یہ چیز حد فاصل نہ تھی، کہ اس میں فی صدی کتنے لوگ لکھنے اور پڑھنے کا پیشہ جانتے ہیں، کیا جب عربوں نے رومیوں اور ایرانیوں کو شکست دیکر تخت و تاج پر قبضہ کیا، وہ اپنی فیصدی تعلیم میں اپنے حریفوں سے بڑھ کر تھے؟ پھر جب ان ہی عربوں کو سسلی میں نارمنوں نے اور اندلس میں اسپینیوں نے اور عراق و خراسان میں تاتاریوں نے شکست دی تو وہ فی صدی تعلیم میں ان نارمنوں اسپینیوں اور تاتاریوں سے کم تھے؟

خود ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک طرف سکھوں نے اور دوسری طرف مرہٹوں نے دبا کر ان کے نظام حکومت کو درہم برہم کر دیا تو سکھ اور مرہٹے اس وقت مسلمانوں سے فی صدی تعلیم میں بڑھ کر تھے؟

عزیزو! یہ "فی صدی" کا لفظ بھی ان منتروں میں ہے جن کو یورپ کے سیاسی ساحروں اور جادوگروں نے اپنی محکوم دنیا میں پھونک رکھا ہے، اور اب ہم اس سے اتنے مسحور ہو گئے ہیں

کہ ہر چیز کو اسی جادو کی ترازو سے تول کر جانچتے اور مانتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی قوت اور طاقت اس کی کمیت اور تعداد میں نہیں بلکہ اس کی کیفیت میں ہے، اگر کہیں صرف تعداد کی کثرت قوت کی مرادف ہوتی تو ۷ ہزار انگریز ۲۳ کروڑ ہندوستانیوں پر حکومت نہ کر سکتے اور نہ چار کروڑ جاپانی چالیس کروڑ چینیوں کو ہر قدم پر شکست دیتے چلے جاتے،

قوم کی ترقی کا راز ان واقعات سے جو مشاہدات ہیں یہ راز خود بخود فاش ہو جاتا ہے کہ قوم کی ترقی کا راز فی صدی کا جادو نہیں بلکہ اس قوم کی قومیت کی معنوی روح اور ذہنی قوت میں ہے، اس کے لئے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ قوم کے سامنے اس کی زندگی کا کوئی متفقہ اور متحدہ مقصد ہو، اس کے افراد اپنے ذاتی اور شخصی اغراض زندگی کے ساتھ ساتھ من حیث المجموع ایک مشترک مقصود زندگی رکھتے ہوں جس کے حصول میں اس کا ہر چھوٹا بڑا، امیر غریب، عورت مرد غرض اس قوم کا ہر فرد پوری طرح مصروف و منہمک ہو اور اسی کی دھن میں اس کا جینا، مرنا، اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، سب کچھ ہو، اور ہر فرد کو یہ متحدہ مقصد اتنا عزیز ہو کہ جب کبھی اس کے سامنے اس کے ذاتی اور شخصی مقاصد اس کے مشترکہ قومی مقصد سے متصادم ہوں تو بے تامل وہ اپنے تمام ذاتی مقاصد اور شخصی فوائد یہاں تک کہ خود اپنے وجود کو بھی اس پر نثار کر دے،

اٹھارہویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ میں جو واقعات پیش آئے، ان کی تحلیل کیجئے تو اس راز سے خود بخود پردہ اٹھ جائے گا، کہ ارکاٹ، سرنگاپٹم، پلاسی، بکسر، لکھنؤ اور دلی میں مٹھی بھر انگریز ہندوستانی ریاستوں اور سلطنتوں کو اس آسانی سے کیونکر توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے تھے، ایک طرف ایک متفقہ مقصد، متحد قوت، اور منظم طاقت تھی، دوسری طرف منتشر اور پراگندہ اشخاص تھے جن میں سے ہر ایک کا مقصود الگ اور مطلب جدا تھا، کہیں اگر کوئی خاندان حکمراں تھا تو اس کے مختلف افراد بھی اس ریاست کی گدی اور مسند کے لئے باہم نبرد آزما تھے، ارکاٹ اور بنگال کی نوابیوں میں کیا

یہی پیش نہیں آیا؟ حیدر علی اور ٹیپو سلطان جنھوں نے اپنے سامنے ایک مضبوط مقصد رکھا تھا، دیکھئے کہ ان کی یہ ذہنی مضبوطی ان کی جسمانی اور فوجی مضبوطی کی صورت میں کس طرح ڈھل گئی تھی اور اس وقت تک اس "آہنی انسان" کی قوت میں کمزوری نہیں آئی جب تک کہ اس کے خاندان اور دربار میں وحدت کی جگہ شخصی مقاصد اور ذاتی منافع کی کثرت نہ آگئی، مذہب کی اصطلاح میں اسی "ذہنی وحدتِ مقصد" کا نام **ایمان** ہے، جس کے بغیر کسی عمل کو اعتبار کا درجہ نہیں مل سکتا،

اخلاق اور کیرکٹر کی مضبوطی جس کے بغیر کسی قوم کی معنوی زندگی کا وجود ہی نہیں ہوسکتا، بہت کچھ اسی مقصدِ عزیز کی گران بہا متاع کی حفاظت، بقا، ترقی اور استواری کی خاطر وجود میں آتی ہے، ایثار، قربانی، عزم، استقلال، فیاضی، بہادری اور موت سے بے خوفی اسی طلسم کے روحانی اسرار ہیں، یہ حقیقت میں وہ جرس ہے جس کی آواز پر قوموں کے قافلے اپنے سفر طے کرتے ہیں، اور کامیابی کی منزل کا پتہ لگاتے ہیں،

سوال یہ ہے کہ ہماری قوم کا اس دنیا میں کوئی بھی متحدہ مقصد ہے؟ اگر نہیں تو وہ قوم نہیں بلکہ جانوروں کا گلہ اور حیوانوں کا جھنڈ ہے،

غور سے دیکھئے اسی ملک میں ہندو قوم آباد ہے، اس پر انقلابات کے بیسیوں دور گذر چکے ہیں صدہا سال کی حیرانی و سرگردانی کے بعد اس نے اب اپنی زندگی کا ایک مقصد قرار دے لیا ہے، ان کے چھوٹے سے لیکر بڑے تک، نوکری پیشے سے لے کر آزادی طلب تک، غریبوں سے لے کر دولتمند مہاجنوں تک، محکوموں سے لے کر ان کے رئیسوں اور راجاؤں تک اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے کانگریسیوں سے لیکر خوشامدیوں تک ہر ایک نے اپنے سامنے کم از کم ایک متحدہ مقصد رکھ لیا ہے، اور وہ مخالفت کی ہر قوت کو ٹھکرا کر اور عائق و مانع کی ہر دیوار کو ہٹا کر ہندو ذاتوں کو واحد قوم بنانا اور اس کے تمام پچھلے خصوصیات کے ساتھ اس کو اس ملک میں مستقل وجود بخشنا، اب اس قوم کی ہر کوشش

ہر راہ سے اسی ایک منزلِ مقصود پر آکر ختم ہوتی ہے، اس کے اہلِ سیاست کی کوشش یہ ہے کہ اسکو سیاسی خود مختاری اور اس ملک پر حکومت کی پوری ذمہ داری بخشیں، اہلِ تعلیم اس کو تعلیمی ذرائع سے حاصل کرنے کے لئے اس کے علم و فن کے پیمانے کو اونچا کر رہے ہیں، اصلاحِ معاشرت کے کارفرما اس کو معاشرتی اور تمدنی طریقوں سے آگے بڑھا رہے ہیں، اہلِ دین اس کی دینی وحدت کی دھن میں ہیں، اہلِ علم اس کے معلومات کا خزانہ بھر رہے ہیں، اہلِ ادب اس کے لئے ایک واحد زبان کی تخلیق میں مصروف ہیں، انتہا یہ ہے کہ اس کے مجبور قیدی بھی ذاتوں کی تفریق کے خلاف حصولِ وحدت کے لئے پسِ دیوار لڑ رہے ہیں، الغرض "قومی وحدت" کی تشکیل کی جتنی صورتیں اور تدبیریں ہیں، قوم کے مختلف کارکن اور کارفرما اپنے اپنے مذاق کے لحاظ سے ان میں سے ہر ایک کی تکمیل میں مصروف ہیں، اور ان میں سے ہر ایک یہ جانتا ہے کہ دوسرا بھی دوسری راہ سے وہیں جارہا ہے، جہاں وہ خود جانا چاہتا ہے، اس لئے راہرو اور راہ بر باہم دست و گریباں نہیں،

الغرض قوم کی زندگی کے لئے سب سے پہلی چیز "وحدتِ مقصد" کا وجود ہے، یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے ارد گرد قوم کے تمام افراد کے اعمال چکر کھاتے ہیں، حکمراں اپنی حکومت کے تخت پر، واعظ اپنے منبر پر، سپاہی اپنے میدان میں، اہلِ پیشہ اپنے بازار میں، عالم اپنی درسگاہ میں، صناع اپنی کارگاہ میں، اخبار نویس اپنے دفتر میں، یہاں تک کہ اس کے مجرم اور ڈاکو بھی اپنی کمین گاہ میں اپنے دوسرے کاموں کے ساتھ اسی ایک مقصد کے لئے جیتے ہیں، اور مرتے ہیں،

تعلیم کا پہلا مقصد مقصدِ زندگی کی تبلیغ

تعلیم کا پہلا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ وہ قوم کے افراد میں اس کے واحد مقصد کی تبلیغ اور تکمیل کا فرض انجام دے، قوم کے ہر فرد میں بچپن سے اس مقصد کی صحت کا یقین اور اس کی رفعت اور بلندی کی تقدیس اور اس کے حصول اور بقا کی خاطر آزمایش اور امتحان میں پڑنے کی غیر متزلزل جرأت پیدا کرے،

ہم کو پہلے سوچنا چاہئے کہ اوّل مسلمانوں کے سامنے اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے ان کی زندگی کا کوئی مقصد ہے بھی؟ اگر ہے تو ہندوستان کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک کوئی درسگاہ اپنے سامنے وہ نصب العین رکھتی ہے؟

ہمارا پچھلا نظام تعلیم کتنا ہی برا سہی، لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے سامنے ایک مقصد تھا، اور وہ مذہب کی خدمت اور اس کے زیر سایہ علوم وفنون کی تحصیل تھا، اس مقصد کا اثر یہ تھا کہ تعلیم ہمارے نظام زندگی میں ایک دنیوی نہیں، بلکہ ایک مذہبی فریضہ تھا، یہاں تک کہ کتابیں اور کتابوں کے اوراق بھی ہمارے نزدیک مقدس اور ادب واحترام کے قابل تھے، ہمارے اندر مذہب کی شیفتگی اور عقیدت تھی، اور اس کی خدمت کے لئے ہر علم وفن کو سیکھتے تھے اور پڑھتے تھے، ہم نے فلسفہ یونان سے اور ریاضیات ہندوستان سے سیکھا، اور اسی طرح دوسرے عقلی علوم بھی دوسری غیر مسلم قوموں سے لئے، مگر غور سے دیکھئے کہ ہمارے اسلاف نے ان میں پوری اصلاح وترمیم کر کے ان کو اپنے نصاب درس میں اس طرح رکھا کہ وہ آج تمام تر اسلامی علوم معلوم ہوتے ہیں، ارسطو اور افلاطون کا فلسفہ جو کہتے ہیں دہریت سکھاتا ہے، جب وہ ہماری مشرقی درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے تو پہلے اعوذ باللہ اور پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر شروع کیا جاتا ہے، خدا کا نام آتا ہے تو نیچر اور فطرت کے بے حس اور بے جذباتی ناموں سے اس کی تعبیر نہیں ہوتی، بلکہ واجب تعالیٰ، باری تعالیٰ اور مبدء فیاض کے فلسفیانہ لیکن با ادب ناموں سے اس کی تعبیر کی جاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فلسفہ پڑھنے کے باوجود مشرقی درسگاہوں کے طلبہ میں بے دینی یا مذہبی بے حسی پیدا نہیں ہوتی،

جب ہمارا فلسفی مصنف اپنے فلسفے کا آغاز کرے گا تو قرآن پاک کی اس آیت کی تعلیم کو اپنی غرض بتائے گا کہ "ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً، (جس کو حکمت دی گئی اس کو

بڑی نیکی دی گئی)، جب ہیئت وفلکیات کا درس دے گا تو تمہید میں یتفکرون فی خلق السموات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا، اور لتعلموا عدد السنین والحساب اور فلکیات کی دوسری مناسب آیتوں کو پہلے پیش کرے گا، جغرافیہ کی کتاب لکھیگا تو کہیگا کہ یہ سیروا فی الارض کی تفسیر ہے، علم طب پڑھائے گا، تو شفاءٌ للناس اور العلم علمان علم الادیان وعلم الابدان کو دیباچے میں ذکر کرے گا، فلکیات کی ایک کتاب کا مصنف امام غزالیؒ کے اس فقرے کو طغرائے فخر بنا کر آگے بڑھتا ہے، "من لم یعرف الھیئۃ والتشریح فھو عنین فی معرفۃ اللہ تعالیٰ (اور جس نے ہیئت اور علم تشریح کو نہیں جانا تو وہ خدا کی معرفت میں نامرد ہے) غرض جس علم وفن کو بھی ہماری کتابی تعلیم ہمارے سامنے رکھتی تھی، اس کو اپنے مقصد میں رنگ کر پیش کرتی تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر عقلی علم وفن اور ہر دنیاوی صنعت وہنر بھی سرتاپا دین اور یکسر مذہب کے پیکر میں جلوہ گر ہوتا تھا، ہمارے اساتذہ آج کل کے علمی دکاندار اور دنیاوی پیشہ ور کی حیثیت نہیں بلکہ وارث پیغمبر، نائب رسول اور روحانی باپ کی حیثیت رکھتے تھے، اس لئے ہر شاگرد اس بات کی کوشش کرتا تھا کہ استاد کے رنگ میں رنگ کر ظاہر ہو اور استاد بھی آج کل کی طرح اپنے کام کو داد وستد کا معاملہ اور ایک سے لینے اور دوسرے ہاتھ سے دینے کی بنیوٹی اور مزدوری کا پیشہ نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ایک مقدس کام اور دینی فریضہ، اس لئے اس راہ میں ان سے وہ وہ ایثار اور قربانی کے مظاہر ومناظر پیش ہوتے تھے جن کو آج کل لوگ مشکل سے باور کر سکتے ہیں،

آجکل کی تعلیمی تاریخ میں یہ کوئی انوکھی بات نہیں کہ چند روپیوں کی خاطر استاد اس کالج سے اس کالج اور اس یونیورسٹی سے اس یونیورسٹی میں دوڑے پھرتے ہیں، اور صرف بڑی تنخواہ کو اپنی عزت کا ذریعہ جانتے ہیں، اور ہمہ وقت پانچ پانچ دس دس روپیے کے اضافوں کی خاطر زمین آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں،

لیکن ہماری پچھلی تعلیمی تاریخ میں یہ واقعے بداخلاقی اور دون ہمتی کی مثال سمجھے جاتے تھے، اول تو تعلیم پر اُجرت اور معاوضہ لینے ہی کو وہ تقویٰ اور دیانت کے خلاف سمجھتے تھے اور پھر لیتے بھی تھے تو وجہ کفاف سے آگے نہیں بڑھتے تھے، وہ بڑے بڑے علما جن کے ناموں کی عزت ہمارے دلوں میں ہے، انھوں نے دس دس اور پندرہ پندرہ روپیوں پر اپنی زندگی بسر کردی ہے، اور لطف یہ کہ وہ اپنے اس ایثار کو ایثار کہہ کر لوگوں پر اپنے احسان کا بار بھی نہیں رکھتے تھے،

تعلیم کے لئے وطن سے باہر نکلنا اور خصوصاً بیرونی ملکوں میں جانا آج ہمارے لئے تعجب انگیز سمجھا جاتا ہے، لیکن ایک وہ زمانہ بھی گذر چکا ہے، جب ہماری نگاہوں کے سامنے زندگی کا مقصد اور حیات کا نصب العین تھا تو علم کی طلب میں خشکی کی مسافت اور تری کی ہولناکی ہماری ہمتوں کو پست اور ہمارے ارادوں کو کمزور نہ کرتی تھی، محدثین نے ایک ایک حدیث کی خاطر مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک کی سرزمین کو چھان ڈالا تھا، بخارا کا یتیم محمد بن اسمٰعیل بخاری اپنی بیوہ ماں کے زیرسایہ ترکستان سے عرب جاتا ہے اور واپسی میں عراق، ایران اور خراسان کے ایک ایک مشہور شیخ کی درسگاہ کو چھان ڈالتا ہے، مصر کے طالب العلم خراسان آتے ہیں، خراسان کے مصر جاتے ہیں، اسپین اور سسلی سے چل کر عراق و مصر و شام و عرب آتے ہیں اور مصر و شام سے اسپین جاتے ہیں، بیت المقدس کے ایک عالم طاہر المتوفی ۵۰۷ھ نے علم کی طلب میں بغداد، مکہ، مدینہ، تنیس، دمشق، حلب، جزیرہ، اصفہان، نیشاپور، ہرات، جرجان، آمد، استرآباد، بوشنج، بصرہ، دینور، رے، سرخس، شیراز، قزوین، کوفہ، موصل، مرو، نہاوند، ہمدان، واسط، اسدآباد، اسفرائین، آمل، اہواز، بسطام، خسروباد وغیرہ شہروں کی خاک چھانی، جغرافیے میں دیکھئے کہ یہ شہر افغانستان کے شہر ہرات سے لے کر ترکستان، خراسان، ایران، عراق اور شام تک پھیلے ہوئے ہیں،

محمد بن مفرج اموی اندلسی کی راہ طلب میں یورپ، افریقہ اور ایشیا تین براعظموں کے شہر داخل

ہیں، اسپین کا شہر قرطبہ، افریقہ کا شہر مصر اور ایشیا کے شہر دمشق، صنعا اور زبید (یمن)، ان کے تعلیمی مقامات ہیں، ولید اندلسی پیدا تو یورپ کے شہر سرقسط (سراگوزہ) میں ہوئے لیکن اندلس سے لیکر خراسان تک کوچہ گردی کی، ابو محمد عبداللہ بن عیسیٰ بن ابی حبیب اندلسی علم اور وزارت کے خانوادے سے تھے، وہ اسپین سے فارغ ہو کر اسکندریہ اور مصر آئے، پھر مکہ گئے، پھر عراق میں داخل ہوئے اور بغداد میں مقیم رہے، پھر خراسان کی راہ لی اور نیشاپور اور بلخ میں قیام کیا، پیدا اسپین کی خاک میں ہوئے اور ۵۴۸ھ میں افغانستان کے شہر ہرات میں پیوندِ زمین ہوئے، حسین بن احمد پیدا قرطبہ میں ہوئے اور ۴۵۶ھ میں یمن کی سرزمین میں دفن ہوئے،

تاج الدین سرخسی ۵۷۳ھ میں پیدا خراسان کے شہر سرخس میں ہوئے، نشو و نما شام میں ہوئی، اور وفات ۵۹۴ھ میں اندلس میں پائی، نحو کے مشہور امام ابوعلی قالی پیدا عراق کے شہر دیار بکر میں ہوئے، پھر تعلیم و تعلم کی خاطر ملکوں کی سیر کرتے بغداد اور موصل سے چل کر اسپین میں جا کر دم لیا اور ۳۵۳ھ میں قرطبہ میں وفات پائی، ابن المقری اصفہان کے محدث تھے جنھوں نے اصفہان، بغداد، موصل، حران، عسقلان، کوفہ، تستر، مکہ، بیت المقدس، دمشق، صیدا، بیروت، عکہ، رملہ، واسط، عسکر مکرم، حمص، رقہ، اور مصر تک چار مرتبہ آمد و رفت کی، کہتے ہیں کہ ابن فضالہ کی ایک تصنیف کے نسخے کی خاطر ستر مرحلے سفر کے طے کئے، اور اس کی حالت یہ تھی کہ اگر کسی نان پز کے سامنے ایک روٹی کے معاوضے میں اس کو پیش کیا جاتا تو وہ اسکو قبول نہ کرتا،

حماسہ کے مشہور شارح تبریزی کا یہ واقعہ سننے کے قابل ہے کہ وہ پیٹھ پر کتابوں کا پشتارہ باندھے جب پیادہ اپنے وطن سے ابوالعلا معری کی خدمت میں شام پہنچے ہیں تو پسینے سے کتابوں کی یہ حالت تھی کہ اس کا ایک ایک ورق دوسرے سے چپک گیا تھا،

آج یورپ کی مشہور یونیورسٹیوں میں دنیا کے گوشے گوشے کے طالب علموں کو دیکھکر

ہم دنگ رہ جاتے ہیں، لیکن اگر پچھلے عہد کی دکھانے والی دوربینیں ہوتیں تو آپ، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، دمشق، صنعا، قاہرہ، بغداد، بخارا، ہرات اور نیشاپور میں ان سے بھی زیادہ حیرت انگیز منظر دیکھتے،

میں اس عہد کی صرف دو درسگاہوں کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، ایک کوفہ میں حضرت امام ابوحنیفہ کی درسگاہ اور دوسری مدینہ منورہ میں امام مالک کی، ابوحنیفہ کے حلقۂ تعلیم میں مکہ، مدینہ منورہ، دمشق، بصرہ، واسط، موصل، جزیرہ، رقہ، نصیبین، رملہ، مصر، یمن، یمامہ، بحرین، بغداد، اہواز، کرمان، اصفہان، حلوان، استرآباد، ہمدان، نہاوند، رے، قومس، دامغان، ترمذ، ہرات، نہسار، خوارزم، سیستان، مدائن، مصیصہ اور حمص کے طلبہ شریک تھے، ذرا نقشے میں ان شہروں کے بعد مسافت پر نظر ڈال لیجئے،

امام مالک کی درسگاہ مدینہ منورہ میں ہے، حالت یہ ہے کہ دنیا کے گوشے گوشے سے موجیں اٹھتی ہیں اور یثرب کی پہاڑیوں سے آکر ٹکراتی ہیں، عرب کے شہروں میں مکہ معظمہ، صنعا، عدن، طائف، یمامہ، ہجر، حضرموت، زبید، فدک، شام کے شہروں میں سے ایلہ، دمشق، عسقلان، غلاط، مصیصہ، بیروت، حمص، طرسوس، رملہ، نصیبین، حلب، بیت المقدس، اردن، صور، اور انطاکیہ، اور عراق کے شہروں میں سے بغداد، بصرہ، کوفہ، حران، موصل، جزیرہ، واسط، انبار، رقہ، رملہ اور ممالک عجم میں سے جرجان، کرمان، ہمدان، رے، طالقان، نیشاپور، طبرستان، طوس، مدائن، قزوین، قوہستان، چغان، آمد، کردستان، دینور، سیستان، ہرات، بخارا، سمرقند، خوارزم (خیوا) مرو، سرخس، ترمذ، بلخ، نسا، مشرق ہو چکا، اب مغرب کی طرف چلئے، مصر کے شہروں میں قاہرہ، اسکندریہ، فیوم، اسفان، تنیس اور شمالی افریقیہ اور اسپین کے شہروں سے افریقیہ، تونس، قیروان، برقہ، طرابلس، مراکش، طلیطلہ، بسطنہ، باجہ، قرطبہ، سرقسطہ اور اٹلی کی سسلی اور ایشیائے کوچک کے سمرنا (ازمیر) سے طالب علم آ اور جا رہے تھے،

ان واقعات کو سنتے وقت یہ بھی ذہن میں رہے، کہ اس وقت دنیا میں نہ آج کی طرح ریلیں تھیں جنھوں نے ایک شہر کو دوسرے شہر سے ملا دیا ہے، اور نہ دخانی جہازات تھے جنھوں نے ایک ملک کو دوسرے ملک سے جوڑ دیا ہے، اور برسوں کے سفر کو مہینوں اور مہینوں کے راستوں کو دنوں میں اور دنوں کی مسافت کو گھنٹوں میں طے کرتے ہیں؛ اور نہ ہاں ڈاک اور تار کے وہ انتظامات تھے جو گھر بار اور اہل وطن کی خبریں دمبدم پہنچاتے رہتے ہیں اور نہ یہ ہوٹل اور مسافر خانے تھے جو مسافروں کو گھروں سے زیادہ آرام پہنچاتے ہیں اور نہ کوک کمپنی کا وجود تھا جو رتی سے پہاڑ تک کا انتظام آپ کے لئے شہر شہر کرتی پھرتی ہے، لیکن ایک لمحہ ٹھہریے، یہ گذشتہ عہد کی داستانِ کہن استخواں فروشی کے لئے آپ کو نہیں سنائی گئی ہے، بلکہ اس سوال کے جواب کے لئے کہ وہ کونسا جذبہ تھا جو طالب علموں کو اس زمانہ میں اس طرح کوچہ بہ کوچہ، شہر بشہر اور ملک بہ ملک لئے پھرتا تھا کہ نہ ان کو پہاڑ روکتے تھے، نہ جنگل ڈراتے تھے، نہ دریا حائل ہوتے تھے، پھر وہ کیا جوش و خروش تھا جو ان کو اس راہِ طلب میں اس طرح بے چین اور مضطرب رکھتا تھا،

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت   دانہ می چیدم من آں روزے کہ خرمن داشتم

عزیزو! وہ صرف ان کا وہ مقصدِ زندگی اور نصب العین تھا جس کو "دین کا ولولہ" اور "مذہب کا جوش" کہتے ہیں، یہ ان کی زندگی کی روح تھی اور ان کی حیات کا مقصد ان کے قبضے میں یہی وہ خزانہ تھا جس سے ان کی تعلیم، تمدن، تجارت، صنعت، سلطنت، حکومت، فتوحات، غرض ایک بامراد قوم کے وہ تمام کارخانے جو زندگی کے مختلف شعبوں سے عبارت ہیں، چل رہے ہیں،

اس کے دوسرے درجہ پر جو جذبہ ہے وہ سیاست کا ہے، اگر اسلام میں دین خود سیاست ہے، تو اس کے یہ معنی ہیں کہ سیاست کا جذبہ اس میں دین کے تحت ہے، ایک اللہ کے ماننے والے خواہ وہ کالے ہوں یا گورے، ایشائی ہوں یا اروپی سب کے سب سلطنت میں برابر کے حصہ دار ہیں، اسلام میں صلح و جنگ اور فتوحات کی ترقی، تجارت، ملک گیری اور قوموں کو غلام بنانے کی

ینت سے نہیں بلکہ اگر ہے تو صرف اس لئے ہے کہ انسانوں میں قومیت، وطنیت اور رنگ روپ کی مختلف برادریوں کی جگہ ہم خیالی کی ایک برادری قائم ہو جائے، انسانوں کے درمیان طبعی اور فطری تفرقوں کو "ملیت" کی بنیاد نہ قرار دیا جائے جو کبھی ٹوٹ اور مٹ نہیں سکتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں کبھی وسعت پیدا ہی نہیں ہو سکتی، بلکہ ان خیالات و ذہنیات کو قرار دیا جائے جن کو سوچنے اور سمجھنے کے بعد ہر انسان اس میں داخل ہو سکتا ہے، اور ملت کا دروازہ ہر متنفس کے سامنے کھلا رہتا ہے، اور اس کی وسعت میں ساری دنیا کبھی سما جا سکتی ہے،

توحید اسلام کی وہ روح ہے جس نے دین کے علاوہ سیاست کا کام بھی انجام دیا اور کم از کم بارہ سو برس تک اس نے ہر میدان میں اسلام کے علم کو بلند رکھا ہے، اسلام کا ہر سپاہی تن تنہا تلوار ہاتھ میں لے کر نکلتا تھا اور چند روز میں نومسلموں کی ایک جماعت اپنے ساتھ لیکر دنیا کے کسی نہ کسی گوشے میں اپنی سلطنت کھڑی کر لیتا تھا، افریقہ میں بحری جزیروں میں اور مختلف ملکوں کے دور دراز گوشوں میں اس طرز سیاست نے بڑی بڑی ریاستیں اور حکومتیں کھڑی کر دیں، اسی طرح غلاموں کو اسلام کی آزادی سے مالا مال کر کے ان کو شمشیر زنی، کشور کشائی اور تخت نشینی کا اہل بنا دیا، مصر میں غلاموں کی سلطنت صدیوں تک اسی طرح چلتی رہی ہے، اسپین اور مراکش کے فاتح بھی بربری نومسلم ہی تھے جنھوں نے بارہا شمالی افریقہ میں حکومتیں کیں،

وہ کون سا جذبہ تھا جو نومسلم ترکوں، تاتاریوں اور مغلوں کو ایک علم کے زیر سایہ منظم کر کے چین کی دیواروں سے لے کر قسطنطنیہ کے سواحل تک کے ملکوں پر ان کو بارہا حکمران بناتا رہا، سبکتگین ایک معمولی ترک غلام سپہ سالاری تک پہنچا اور پھر غزنی میں بیٹھ کر وہ خاندان پیدا کرتا ہے، جو ہندوستان پر سو سال تک چھایا رہتا ہے، غور کے نومسلم جو محمود ہی کے مسلمان بنائے ہوئے ہیں، وہ اٹھتے ہیں اور آندھی کی طرح غزنی سے لے کر بحر ہند تک پر قابض ہو جاتے ہیں،

ان مثالوں سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں دکھاؤں کہ اسلام نے کیونکر دین ہونے کیساتھ سیاست کا فرض انجام دیا، دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے کہ اسلام کا جذبۂ دین بجائے خود اس قدر پر زور اور قوی ہے کہ اس کو اپنی زندگی کے لئے کسی الگ سیاسی قوت کا سہارا ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہے،

عشق خود راہ است و ہم خود منزل است

وطنیت

بایں ہمہ اس حقیقت سے تغافل نہیں برتا جا سکتا کہ یورپ نے دو سو برس سے مشرقی قوموں اور اسلامی ملکوں میں جو فساد برپا کر رکھا ہے اس کے لئے یہ لازمی ہو گیا ہے کہ ایک ملک کی بسنے والی تمام قومیں اور جماعتیں باہم ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اس طرح دوش بدوش کھڑی ہوں کہ حریف ہماری صفوں کو چیر کر درہم برہم نہ کر سکے، اس کے لئے ضرورت ہے کہ اسلامیت اور وطنیت کو ٹکرانے کے بجائے اسی طرح ان میں تطبیق دیجائے جس طرح ہم عقل و نقل اور معقول و منقول کو تطبیق دیتے ہیں، غلط فہمی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلامیت اور وطنیت باہم ایسے حریف ہیں جنمیں کبھی صلح نہیں ہو سکتی، اسلامیت کے حامی ہر چیز میں مسلمانوں کی علیحدگی کے خواہاں ہیں، اور وطن کی دوسری قوموں سے مل کر متحدہ محاذ کے بجائے محاذ کو تقسیم کر کے اس کی حفاظت اور مدافعت کے فرائض کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کرنا چاہتے ہیں، دوسری طرف وطنیت کے طرفدار اس تفریق و امتیاز کے لئے مذہب کو ذمہ دار سمجھ کر اسلامیت کے جذبات سے تبری کرنے پر آمادہ ہو رہے ہیں، پہلے کا نتیجہ اگر وطن کی خدمت سے قصور ہے تو دوسرے کا نتیجہ مذہب سے بیزاری ہے اور یہ دونوں نتیجے ہم کو ہلاکت اور بربادی کی طرف لیجاتے ہیں، حالانکہ جس طرح عقل و نقل کی تطبیق ممکن ہے، ایسے ہی دین اور وطن کی تطبیق بھی ممکن ہے، سنہ ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت اور جمعیۃ علماء کے نظریۂ سیاست نے امکان کو واقعے کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے، کیا سنہ ۱۹۲۰ء کا خلافتی اس عہد کے کانگریسی سے کسی حیثیت میں پست تھا اور موجودہ عہد کی

تحریک میں جمعیتی خادمانِ وطن کانگریسی خدمت گذاروں سے کسی بات میں کم نہیں ، حالانکہ سب کو معلوم ہے
جمعیۃ العلماء سرتاپا مذہبی جماعت ہے ، اور باایں ہمہ وطنی خدمات میں خالص وطن پرستوں سے کسی طرح
کم نہیں ، میرے نزدیک جس طرح ندوۃ العلماء کی درسگاہ عقل ونقل کی تطبیق ہے ، جامعہ ملیہ اسلامیت
اور وطنیت کی تطبیق ہے ، اور اسی لئے یہ دونوں درسگاہیں مسلمانوں کی آیندہ تعلیم میں بہت بڑا اثر رکھینگی ،

میرے نزدیک جب تک ہندوستان کے مسلمان اسلامیت اور وطنیت کی کشمکش کا
کا بہترین فیصلہ نہ کریں گے ، اس ملک میں ان کا مستقبل حد درجہ خطرناک رہیگا ،

ہندوستان میں اسلامیت اور وطنیت کی مصالحت اور تطبیق

ان تمام ملکوں میں جہاں مسلمانوں کو تعدادی اکثریت حاصل نہیں ہے
ان کے دینی اور وطنی فرائض میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی بہترین
صورت یہ ہے کہ خالص مذہبی اور قومی امور و مسائل میں اپنی حکومت کے زیر سایہ نیم خود مختاری حاصل
کرکے ملک کے عام سیاسی و انتظامی امور و مسائل میں اپنے دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ اشتراک
عمل کریں ، صاف لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان کے اپنے مذہبی و تمدنی مسائل میں جن سے
قومیت عبارت ہے ان کی وطنی حکومت ان کو اپنے زیر سایہ خود مختاری عطا کرے اور دیگر عام ملکی
سیاسی انتظام و مسائل میں وہ دیگر فرزندانِ وطن کے دوش بدوش ایک متحدہ نظام کا جزو ہو کر اپنی
تعدادی حیثیت کے مطابق اشتراکِ عمل کریں ، موجودہ سیاسی اصطلاح میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں ، کہ
ایک طرف مسلمان اپنے لئے بلاشرکت غیرے "کلچرل آٹانومی" حاصل کریں اور دوسری طرف عام
ملکی سیاسیات میں وہ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ شریک رہ کر اپنی آبادی کے مطابق حقوق اور نمایندگی
پر قناعت کریں ، اس طرح مسلمانوں کی ایک امتیازی قومی حیثیت بھی قائم ہو جاتی ہے ، اور دوسری
طرف ان پر وطنی اتحاد کے توڑنے کا الزام بھی قائم نہیں ہوتا ، جن مذہبی و قومی اغراض و مصالح
کی حفاظت کی خاطر وہ نمایندگی اور انتخاب نمایندگی کی علحدگی کا مطالبہ کرتے ہیں وہ بجائے خود علحدہ

نمایندگی سے طے ہونگے ، اور پھر دوسری طرف عام سیاسیات میں ان کو دوسروں سے نہ کوئی رعایت
چاہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ استحقاق سے زیادہ مطالبہ کی بھیک مانگنے کی ذلت اٹھانی پڑتی
ہے اور نہ لوگوں کو عام ملکی معاملات وسیاسیات میں ان کی مخصوص قومی معاملات میں علحدگی کی بناء پر
ملکی تفرقے کا خیال پیدا ہوسکتا ہے ،

اس طرح مسلمانوں کی دو مجلسیں ہونگی ، ایک خالص اسلامی جو ان کے خالص اسلامی اُمور و
معاملات کا فیصلہ کرے گی ، اور دوسری مخلوط مجلس خواہ وہ مخلوط ہی انتخاب سے ہو جو عام ملکی مسائل
کا تصفیہ کرے گی ،

میں نے جہانتک ان مسائل پر غور کیا ہے اس سے زیادہ بہتر حل اس مشکل مسئلہ کا نظر نہیں آتا ،
یقیناً کسی ایسے نظام کے جزئیات کو طے کرنے اور اس کو بنا کر کھڑا کرنے میں جو پہلے سے ملک میں رائج نہ ہو
ایک اجنبیت محسوس ہوتی ہے ، مگر جس طرح نئی اصلاحات کے ہر نظام کو بالآخر ہم طے کرکے عمل میں لاتے
ہیں اسی طرح اس پر بھی ہم عمل کرسکتے ہیں ،

اس مختصر تشریح سے یہ ظاہر ہوگا کہ ہندوستان میں ہماری قومی زندگی کے حسب ذیل مقاصد ہیں :

۱ - پیغامِ اسلام کی تعمیل ، حفاظت اور بقا ،

۲ - اس ملک کے لئے ایک عام جمہوری نظام حکومت کا قیام ،

۳ - اس عام ملکی جمہوریہ کے ماتحت خالص "اسلامی کلچرل آٹانومی" کا قیام ،

یہ وہ مقاصد ثلاثہ ہیں جن کو ہم اپنی قومی زندگی کی روحِ عمل قرار دے سکتے ہیں ، ان کے لئے جد و جہد
اشاعت و تبلیغ اور بالآخر کامیابی اور کامیابی کے بعد ان کی حفاظت اور بقا ہماری قومی زندگی کا مستقل
پروگرام ہوسکتا ہے ،

شاید اس موقع پر مجھ سے اپنے موضوع سے ہٹنے کی بازپرس کیجائے ، لیکن اگر میری تقریر کا پچھلا

حصہ حاضرین کے ذہن نشین ہو تو یقیناً وہ میری طرف سے اس بازپرس کا جواب دے سکتے ہیں، میرے نزدیک تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ قوم کے بچوں کو ان کی زندگی کے قومی مقاصد کی تلقین اور تفہیم کرے اور ان کے اندر ان مقاصد کی یقینیت کی روح پیدا کر کے ان کو سراپا عمل بنائے، دنیا میں آج جہاں کہیں کوئی قومی حکومت ہے اسی اساس تعلیم پر ان کی قومی عمارت کی بنیاد قائم ہے، انگلستان میں جس طرح آکسفورڈ اور کیمبرج انگریزوں کے تعلیمی مرکز ہیں، اسی طرح ان کے نظری سیاسیات کے مرکز بھی ہیں، وزیر اعظم سے لیکر معمولی رکن پارلیمنٹ تک ان درسگاہوں کے احاطوں میں آکر اپنی سیاسیات کے نظریوں کو بیان کرتا اور وہاں کے طالب علموں کو آیندہ کی سیاسی ذمہ داری کیلئے تیار کرتا رہتا ہے،

اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ موجودہ نظام حکومت نے ہندوستان پر سب سے بڑا ظلم کیا کیا ہے تو میں کہونگا کہ اس کا سب سے بڑا ظلم اس ملک کے بچوں کی بے مقصد تعلیم ہے جس نے پوری قوم کی زندگی کو بے مقصد بنا دیا ہے اور دنیا میں ایک ایسی قوم کی تخلیق کی ہے جس کی زندگی کی کوئی غایت نہیں ہے، سبب کھلا ہوا ہے، انگریزی حکومت نے اس ملک کی تعلیم کو قومی تعلیم و تربیت کی نظر سے نہیں بلکہ سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا، اس کو ضرورت ہوئی کہ مسلمانوں کی اور دوسری قوموں کی اس روحانی زندگی پر موت طاری کر دی جائے جس سے قومی و مذہبی عصبیت پیدا ہوتی ہے اور اس کے لئے ضروری ہوا کہ اس تعلیم کو ہر قسم کی مذہبی اور قومی تعلیم کی اسپرٹ سے خالی کر دیا جائے،

دوسری طرف اس کو اپنی سلطنت کے چلانے کے لئے ایسے کم قیمت دیسیوں کی ضرورت تھی جو اس کے محکموں کے دفتری کاروبار کو سنبھال سکیں، اس لئے ایک ایسا نظام تعلیم جاری کیا جس میں کوئی زندگی نہ تھی اور علوم میں سے بھی صرف وہ چیزیں سکھائی جائیں جن کی ضرورت آیندہ بننے والے کلرک (بابوؤں) کو پیش آسکتی ہے،

اسکول تک ہم کو کیا سکھایا جاتا ہے؟ ایک ایسی بدیسی زبان جس کے ذریعہ سے ہم اپنے

آقاؤں سے گفتگو کر سکیں اور ان کے لئے ان کی زبان میں مواد مہیا کر کے رکھ سکیں، اور جغرافیہ جس میں زیادہ تر ہم یہ جانیں کہ وہ دنیا کے کون کون سے براعظم جزیرے اور ٹاپو ہیں جہاں وہ علم لہراتا ہے جس کا آفتاب دنیا سے کبھی نہیں ڈوبتا اور تاریخ جس میں ہم کو یہ سکھایا جاتا ہے، کہ ہندوستان کی موجودہ قوموں نے کیونکر ایک دوسرے پر ظلم کیا ہے، تاکہ اس ملک کی قومی تفریق کا ناسور کبھی بھرنے نہ پائے،

ہندوستان کی تاریخ کا وہ حصہ جس میں ہندوستان کی انگریزی شہنشاہی کے بنانے والے لارڈوں کا ذکر ہوتا ہے، پڑھ کر بے انتہا ہنسی آتی ہے، ہر لارڈ نے اس ملک کی اصلاح کی خاطر جو تکلیفیں اٹھائی ہیں اور جو انتظامات کئے ہیں ان کا ذکر ہوتا ہے، پھر وہ رخصت ہو کر جب جاتا ہے اور دوسرا آتا ہے تو پھر ان ہی مناقب کی تکرار ہوتی ہے، اس لغو طریقۂ نصاب کا جس قدر جلد ہندوستان سے خاتمہ کیا جا سکے، اسی قدر بہتر ہے اور اس کے بجائے ہم کو وہ نصاب اختیار کرنا چاہئے جن سے ہمارے قومی مقاصد کے جذبات کی پرورش اور تکمیل ہو اور قوم کو زندہ قوم، سرگرم عمل قوم اور بامقصد قوم بنائے،

ہم نے ہزاروں لاکھوں کے صرف سے ملک میں جابجا اسلامی اسکول، اسلامی کالج بلکہ اسلامی یونیورسٹی قائم کی ہے، لیکن اس سوال کا کوئی جواب ہے کہ قومی نقطۂ نظر سے اس قسم کے اسلامی اسکول اسلامی کالج اور اسلامی یونیورسٹی کس قدر مفید ثابت ہوئے ہیں اور بے مقصد تعلیم کے سوا ان سے کیا فائدہ پہنچا ہے، بجز اس کے کہ ان کے قیام سے چند مسلمان ماسٹروں اور پروفیسروں کی پرورش ہوتی ہے، اور کچھ مسلمان طالب علموں کو کلاس میں جگہیں مل جاتی ہیں، مگر ان کو اس نظر سے اگر دیکھا جائے کہ یہ قوم کے ذاتی سرمایہ سے سرکاری نظام تعلیم کی اشاعت کا فرض انجام دیتا ہے تو یہ بالکل لاحاصل معلوم ہوتے ہیں، کہ قومی سرمایہ سے جو اسکول اور کالج قائم ہوتے ہیں وہ قومی تاریخ کے بجا

سرکاری مدارس سے کس حال میں بہتر ہیں؟ اسی لئے میرے نزدیک سرکاری نظام تعلیم کی مجبورانہ پیروی کی حالت میں بہتر یہ ہے کہ ہم اس سرمایہ کو طلبہ کے وظائف دینے اور شہروں میں صرف اسلامی دارالاقامے قائم کرنے میں صرف کریں کہ ان اسلامی اسکولوں اور کالجوں سے جو فائدہ پہنچنا ممکن ہے وہ درسگاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ دارالاقامے کی حیثیت سے ہے،

بہرحال یہ ایک جملہ معترضہ ہے، کہنا یہ ہے کہ بے مقصد تعلیم سے قومی ترقی اور ملت کی زندگی کی توقع رکھنا پنجاہ سالہ تجربے کو جھٹلانا ہے اور اس تعلیم نے صرف نوشت وخواند کے ہنر کی تعمیم واشاعت کے لحاظ سے خواہ کسی قدر فائدہ پہنچایا ہو مگر قوم کی زندگی اور ملت کی سربلندی میں اس سے فائدے کے بجائے روزافزوں نقصان پہنچ رہا ہے، مذہبی مقصد زندگی سے تغافل کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حرف لایعنی جنکا زبان پر لانا بھی پہلے مشکل تھا اب وہ برملا ادا کئے جارہے ہیں اور قومی تخیل سے بے پروائی کا نتیجہ یہ ہے کہ قومیت کا شیرازہ بکھر رہا ہے اور خیالات و اعتقادات کی وحدت کی گرفت جس سے وحدتِ قومیت عبارت ہے ڈھیلی پڑتی جارہی ہے اور ایک ایسی قوم پیدا ہو رہی ہے جو ظاہر و باطن دونوں لحاظ سے حکمران قوم کے ثقافے کی صرف نقل ہے،

مسلم یونیورسٹی کے لئے ۱۹۱۱ء میں جس وقت ملک میں جوش وخروش برپا تھا، مولانا شبلی مرحوم نے لاہور کے وفد میں اپنی وہ فارسی نظم پڑھی تھی جس کا ایک مصرع یہ ہے،

کایں سررشتہ تعلیم مادر دست ما باشد

لسان العصر اکبر مرحوم نے فوراً اس پر برجستہ جوابی نظم کہی تھی جس کے ایک مصرعے کے آخری الفاظ یہ تھے،

"مگر دست شما دست شما باشد"

لوگوں نے شاید اس کو صرف شاعرانہ سوال وجواب پر محمول کیا ہو مگر بیس برس کے بعد معلوم ہو گیا کہ لسان العصر نے جو شبہ ظاہر کیا تھا وہ شبہ نہیں حقیقت تھا، اس طول بحث اور درازنفسی کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سامنے اب یہ حقیقت واقعہ بن کر سامنے آجانا چاہئے کہ ان کو پہلے اپنا قومی نقطۂ نظر اور ملی زندگی کا مقصد متعین کرنا چاہئے اور اس پر اپنی تعلیمی عمارت کی بنیاد قائم کرنی چاہئے اور آیندہ ہماری درسگاہیں صرف نوشت وخواند کا حرفہ اور پیشہ سکھانے کے لئے نہ ہوں، بلکہ زندہ قوم کے افراد کی تخلیق اور آفرینش کے لئے ہوں،

اسی لئے مسلمانوں کی آیندہ تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ ایسی درسگاہیں بکثرت قائم کیجائیں، جو بامقصد ہوں اور ان کا سر رشتہ واقعی مسلمانوں کے حقیقی ہاتھوں میں ہو، مسلمانوں نے اس ملک پر ایک ہزار برس تک حکومت کی، مگر انھوں نے ہندوستان پر یہ ظلم کبھی نہیں کیا کہ یہاں کے کروڑوں دماغوں کی تربیت اپنے سیاسی ہاتھوں میں لے کر ان کو مذہبی وقومی جذبات سے یکسر خالی کردیں اب ضرورت ہے کہ مسلمان اس نظام تعلیم سے علانیہ بغاوت کریں اور ایسی درسگاہوں کی بنیاد قائم کریں جو ان کو ان کی زندگی کا مقصد بتائیں، اور ان پر ان کی حیاتِ ملی کے اسرار کھولیں،

ایک زمانہ تھا کہ جب سرکاری نوکری ہی مسلمانوں کی زندگی کا تنہا مقصد تھی، اس وقت ملک کی عربی درسگاہوں پر یہ پھبتی کہی جاتی تھی کہ یہ اپاہجوں کے پیدا کرنے کی کلیں ہیں، اس طعن کو قبول کرلینے کے بعد بھی ہم یہ دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بظاہر خواہ کسی قدر پست و متبذل حالت میں ہوں تاہم وہ بامقصد ہیں اور اپنے مقصد پر ان کو ناز ہے اور زمانے نے بتادیا کہ زمانے کی بے التفاتیوں اور بے توجہیوں کے باوجود زندگی رکھتی ہیں اور آپ کو سنکر تعجب ہوگا کہ آجکل کے ایک بڑے سرگرم کانگریسی نے مجھ سے یہ کھلا اعتراف کیا کہ موجودہ قومی مقاصد کے سمجھنے میں اور ان پر عمل کرنے میں آزاد عربی مدارس کے تعلیم یافتہ غلام انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ سے

بڑھ کر ثابت ہوئے، اس کا سبب بالکل کھلا ہوا ہے کہ آزاد عربی مدارس کی تعلیم کا مقصد سرکاری نوکری
اور سرکاری اعزاز کی تلاش نہیں جو ہمارے ہر قومی حوصلے کو پست کر دیتی ہے،

مسلمانوں کی علحدہ تعلیم

اوپر کے معروضات اگر ذہن نشین ہوں تو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں عذر نہ ہونا چاہئے کہ مسلمانوں
کی بامقصد تعلیم کے لئے یہ نہایت ہی ضروری ہے کہ ان کی قومی درسگاہیں بالکل الگ ہوں جہاں ان کو
خاص ان کے مذہبی و قومی مقاصد کی بنا پر تعلیم دیجائے، ہمارے بہت سے مسلمان دوستوں کی یہ خواہش
ہے کہ سرکاری کونسلوں میں ان کی نشستیں معین ہوں، اور ان نشستوں کا انتخاب مخلوط نہ ہو تا کہ مسلمانوں کی قومی
کی مستقل ہستی قائم رہے، میرا خیال ہے کہ سرکاری نشستوں میں عدم مخلوط انتخاب سے کہیں زیادہ
ضروری یہ ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت مخلوط نہ ہو تا کہ ان کی علحدہ قومی ہستی فنا نہ ہو جائے، اور ان کے
قومی مقصد کی مستقل زندگی برباد نہ ہو جائے،

اسی اصول کی بنا پر مسلمانوں کی ابتدائی تعلیم کا مسئلہ نہایت غور و فکر کے قابل ہے، مسلمان ملک
کی دوسری قوموں کی طرح میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ٹکس ادا کرتے ہیں، لیکن آپ دیکھیں گے
کہ وہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی تعلیم سے بہت کم فائدہ اٹھاتے ہیں، اکثر میونسپل اور تحصیلی اسکول
تقریباً ہندو اسکول ہیں، وہاں کی تعلیم کیا اپنی زبان کے لحاظ سے اور کیا اپنے جذبات کے
لحاظ سے تمام تر ہندو ہے، مذہبی تعلیم سے وہ یکسر خالی اور جذبات ملی سے یکسر عاری ہیں، ایسی حالت
میں مسلمان طلبہ کا ان میں کم ہونا قدرتی ہے،

یہ تو ان مدارس کا سلبی پہلو ہے، ایجابی پہلو یہ ہے کہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ابتدائی مکتب
دیہاتی اور شہری ہندو آبادی کی ابتدائی تعلیم کے تمام تر کفیل ہیں، مگر مسلمان ان مدارس و مکاتب سے
بجا طور پر احتراز کرتے ہیں اور نہ خود اپنی طرف سے اور نہ سرکار کی طرف سے ابتدائی مکاتب کا اتنا وسیع
سلسلہ اپنے قبضے میں رکھتے ہیں، ایسی حالت میں دوسری قوم کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ابتدائی تعلیم میں

کم ہونا بالکل کھلی بات ہے، یوپی میں سرکاری اسلامی مکاتب کی اسکیم بھی اسی لئے ناکام ہے کہ ان کیلئے
بھی ان کے سررشتے کا خاص لازمی نصاب قبول کرنا ضروری ہے، جو ہمارے اغراض کے مطابق نہیں،

مکتبی تعلیم کا نظام

پورا ملک ابتدائی اسلامی مکاتب کے متحدہ نظام کے سلسلے سے بالکل محروم ہے، بجا
شخصی یا جماعت کے چندوں سے کہیں کہیں بعض مکتب ہیں جن میں سے ہر ایک انفرادی طریق تعلیم
اور الگ نصاب پر جاری ہے اور جو ہر قسم کی ترقی کی اسکیم سے محروم ہے، پورے ملک میں چھوٹے
بچوں کا ایک بھی معیاری مکتب نہیں جو چھوٹے بچوں کی مکتبی تعلیم و تربیت کا نمونہ پیش کرے، جامعہ ملیہ
کے کارفرما دوستوں اور ندوۃ العلماء کے ارکان کے سامنے میں نے اس ضروری تجویز کو پیش کیا ہے،
مجھے خوشی ہے کہ جامعہ کے کارفرما ادھر توجہ کر رہے ہیں، اور ان کے احاطے میں اس قسم کے معیاری مکتب
کے بننے کی پوری صلاحیت موجود ہے، گورکھپور میں انجمن اجرائے مکاتب کے نام کی ایک مجلس
نے چند سال سے کام شروع کیا ہے، اور اس وقت تک چالیس مکتب ضلع میں قائم کئے ہیں، اسی
قسم کے اجرائے مکاتب کی ہر ضلع میں ضرورت ہے، جن کے پیش نظر صرف ابتدائی مکتبی تعلیم ہو، اور
ہمارا حق پہنچتا ہے کہ ہم میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے اپنے ان مکتبی سلسلوں کے لئے مالی
امداد کا جائز مطالبہ کریں، اور جب کبھی ہندوستان کے نظام حکومت کا آسمان و زمین بدلے ہم یہ
مطالبہ کریں کہ مسلمانوں کی اس تعلیم کا پورا انتظام اس صیغہ کے سپرد کر دیا جائے جس کا مطالبہ مسلمان اپنے
مستقل قومی و مذہبی امور و معاملات کے سلسلے میں کر رہے ہیں،

میری اس گذارش سے اس نتیجے تک پہنچنا آسان ہے کہ قومی تحفظ کے لئے مسلمانوں کے غیر مخلوط
انتخاب کے مطالبے سے بہت زیادہ ضروری غیر مخلوط تعلیم کا مطالبہ ہے، خصوصاً جب وہ وقت آئیگا
کہ ملک میں جبری تعلیم کا نفاذ ہو اس وقت مسلمانوں کے لئے علحدہ مستقل نظام تعلیم کی ضرورت آج
سے زیادہ عیاں ہو جائے گی،

ضرورت ہے کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم پر پوری توجہ کیجائے، اور اس کے لئے ٹرینڈ معلم تیار کئے جائیں اور بچوں کے نفسیات سے باخبر اہلِ قلم ان کی استعداد کے مطابق ایسا تدریجی نصاب بنائیں جو سادہ سے سادہ سہل سے سہل ہو" حمایت اسلام لاہور" کا نصاب بہت کچھ مقبول ہے، مگر افسوس ہے کہ اس میں الفاظ کے استعمال میں بے احتیاطی برتی گئی ہے، مثلاً دینیات کی پہلی ہی کتاب میں محتاج، پیغمبر وغیرہ الفاظ جو پانچ پانچ حرفوں سے مرکب ہیں، استعمال کئے گئے ہیں، کیا بچہ آسانی سے ان کا تلفظ کرسکتا ہے، نصاب کے الفاظ چھوٹے چھوٹے آسان اور سہل ہوں، ان کی کتاب اس احتیاط سے چھاپی جائے کہ ہر نقطہ اور شوشہ اس طرح اپنی جگہ پر لکھا ہو کہ بچے کو اشتباہ نہ ہو

ابتدائی تعلیم میں دو اور مشکلیں حل کرنی ہیں، قرآنِ پاک کے پڑھانے کے آسان طریقے کی تلاش تاکہ قرآنِ پاک جلد سے جلد ختم ہوسکے، لوگ قرآن پاک پڑھانے کے لئے پہلے قاعدہ بغدادی، پارہ عم وغیرہ پڑھاتے ہیں اور اسی سے تعلیم کا آغاز کرتے ہیں، میرے خیال میں یہ طریقہ غلط ہے، میرا تجربہ ہے کہ پہلے بچہ کو اردو پڑھائی جائے اور جب اردو داں ہوجائے تو اردو عبارت عربی خط میں چند دن پڑھائی جائے، اس کے بعد قرآن پاک شروع کرایا جائے، اس سے کم از کم ایک سال کا وقت بچ جاتا ہے، لیکن ضرورت ہے کہ بچوں کے لئے ایسے قرآن چھاپے جائیں جن میں خط کی بلکہ ہر حرف کی اور نقطے اور شوشے کی پوری احتیاط کتابت میں کیجائے تاکہ حروف اور نقطے بچوں کی نظروں میں مشتبہ نہ ہونے پائیں، اور ہر حرف کی صرف ایک ہی شکل پورے قرآن کی کتابت میں اختیار کیجائے تاکہ اختلافِ صور بچوں کا ذہن اس حرف کے پہچاننے میں مشوش نہ کرے،

پھر اس پر بھی غور کرنا ہے کہ ہندوستانی زبان کے مفرد اور مرکب حروف اور الفاظ کے پڑھنے کی آسان سے آسان صورت کیا ہوسکتی ہے، افسوس ہے کہ انجمن ترقی اردو کے سوا اور کسی نے ادھر توجہ نہیں کی ہے،

بچوں کے لئے جو نصاب بنایا جائے اس میں شروع سے اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ وہ ان کی مذہبی اور قومی روح کی تربیت کرے، بدیسی نظامِ تعلیم کی بے مقصد کتابیں جن میں چوہا اور بلی کے بے جوڑ اور بے مزہ قصے ہمارے بچوں کے لئے وہ غذاے فاسد ہے جو جزو بدن نہیں ہوتی بلکہ ان کے دماغی ہاضمے کو ابھی سے خراب کرڈالتی ہے اور ہم نے بار بار کہا ہے کہ بے مقصد تعلیم قومی زندگی اور ملی حیات کے لئے ایک ذرہ کارآمد نہیں،

ہم ترکوں کو ملحد کہنے کے عادی ہیں، لیکن بہرحال انھوں نے اتنا پورے یقین کیساتھ سمجھ کر لیا ہے کہ اگر ہمکو زندہ رہنا ہے تو بامقصد قوم ہوکر زندہ رہنا ہے، چنانچہ اسی لئے انھوں نے اپنے سیاسی انقلاب کے ساتھ تعلیمی انقلاب کو ضروری سمجھا ہے، امریکہ کے ایک مشنری رسالے "مسلم ورلڈ" نے ترکی ابتدائی تعلیم کی ریڈروں سے ایک سبق نقل کیا ہے جو درج ذیل ہے:۔

"مذہب اسلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور ہمارے پیغمبر صلعم پر ایمان لایا جائے جنھوں نے ہم کو اسلام کی تعلیم دی، ہم اللہ تعالیٰ اور پیغمبر صلعم پر عقیدہ رکھنے کو ایمان کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ جس نے کل کائنات اور ہم کو پیدا کیا قدرت والا ہے، ہم پورے طور سے یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کیا ہے یا کیونکر ہے، وہ بہت بڑا ہے۔ . . . . .

بچو! تم دیکھتے ہو کہ ایمان لوگوں میں اتحاد پیدا کرتا ہے اور ان کو قوت اور مسرت بخشتا ہے

اللہ تعالیٰ پیغمبر صلعم اور مذہب اسلام پر عقیدہ رکھنا مذہبی ایمان ہے،

ہمارا ایک قومی ایمان بھی ہے ہم ترک ہیں، ترک تہذیب یافتہ اور متمدن ہیں، ہمارا ملک ہمیشہ ترقی کرتا جائے گا، اور ہمیشہ دشمنوں پر فتح یاب ہوگا جس وقت ترک کا نام لیا جاتا ہے، میرا سینہ فخر سے پھول جاتا ہے اور میرا سر بلند ہوجاتا ہے، میں ان لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو میری قوم اور میرے ملک کے لئے مفید ہیں، جو میرے محبوب ملک کو

نقصان پہنچاتے ہیں ان سے مجھے مطلق محبت نہیں "

اوپر کے اس ابتدائی سبق پر غور کیجئے کہ ترک مدبروں نے تعلیمی حقیقت کا پتہ کس طرح پالیا ہے، اور دین و وطن کے دوگونہ جذبات کو باہم کس طرح ایک دوسرے سے ہم آغوش کیا ہے، یہی وہ راز ہے جو قوموں کی ان کی منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کرتا ہے،

اخلاق کی تعمیر تعلیم کا دوسرا حقیقی مقصد اخلاق کی تعمیر ہے، مذہب اور فلسفہ دونوں نے اس کو اصولاً مان لیا ہے کہ انسان بہت سی باتوں میں مجبور ہونے کے باوجود اپنے ارادے اور نیت کی آزادی بہرحال رکھتا ہے، اور یہی آزادی اس کی ذمہ داریوں کی بنیاد ہے،

غریب کشمکشِ جبر و اختیار میں ہے

لیکن انسانوں کے علاوہ دوسری مخلوقات اس کشمکش کے اختیار سے بھی محروم ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی جبلت یا اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور محض ہیں، اور ان لوازم خصائص اور اثرات کی بجا آوری پر مضطر ہیں جن کے لئے ان کی خلقت ہوئی، آفتاب سے نور ہی ظاہر ہوگا، گلاب سے خوشبو ہی نکلے گی اور سنکھیا سے موت ہی صادر ہوگی، مگر انسان سے نور اور تاریکی، خوشبو اور بدبو حیات اور ممات دونوں صادر ہو سکتی ہیں، اس کے اخلاق اور خصائل تربیت پذیر ہیں اور اسی لئے وہ تعلیم و تربیت کا محتاج ہے،

دوسرے لفظوں میں یہ کہئے کہ کائنات کی ہر مخلوق فطرۃً اسی کام کے کرنے پر مجبور ہے جس کے لئے اس کے خالق نے اس کو پیدا کیا ہے لیکن انسان تھوڑا اختیار پاکر فعل اور ترک فعل کے درمیان ترجیح کا حق رکھتا ہے، اس لئے ضرورت اس کی پیدا ہوتی ہے کہ وہ پہلے ان اغراض کو سمجھے جن کے لئے اس کی خلقت ہوئی ہے، اور پھر ان کی اغراض کے مطابق اپنے کام کو پوری مستعدی اور دیانتداری سے انجام دے، خلقت کے صحیح اغراض کے سمجھنے کا نام "تعلیم" ہے، اور ان کے مطابق عمل کرنے کا نام

"تربیت" ہے اور ان تربیتی اعمال کا نام "اخلاق" ہے تعلیم کی بڑی غرض و غایت یہ ہے کہ ان اخلاق کی صحیح تعمیر کیجائے تاکہ وہ فرائض بخوبی ادا ہوں جن کے لئے وہ اس دنیا میں آیا یا بھیجا گیا ہے،

ہماری موجودہ تعلیم جس طرح بے مقصد ہے اسی طرح یہ تمام تر بے اخلاق بھی ہے، ملک میں مسلمانوں کی ایک درسگاہ بھی ایسی نہیں ہے جس نے اخلاق کی تعمیر اور تربیت کی اہمیت کو سمجھا ہو، اور جس نے اپنی زندگی کا مقصد "با اخلاق انسان" کا پیدا کرنا قرار دیا ہو، اسی لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عزت ہماری نگاہوں میں ایک خاص حیثیت رکھتی ہے کہ نئی تعلیم کی درسگاہوں میں یہ پہلی درسگاہ ہے جس نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور اس کی تکمیل کے لئے کوشاں ہے،

عموماً اخلاق کے معنی ہماری زبان میں نہایت محدود ہیں، اخلاق کے لفظ سے ہمارا مقصود یہی محدود معنی نہیں بلکہ ان سے کہیں بڑھ کر وسیع ہے، اخلاق سے مقصود انسان کی قوتِ نفسی کی ایسی تربیت اور مشق ہے جس سے وہ اپنے شخصی، انسانی اور قومی فرائض کے ادا کرنے کی پوری استعداد اور صلاحیت پیدا کرے، درسگاہ کا اہم فرض یہ ہے کہ اپنے احاطہ کے اندر ایسی فضا اور ماحول پیدا کرے جو دنیا کی فاسد اور مسموم آب و ہوا سے محفوظ ہو کر صالح اور صحیح اور طاقت ور آب و ہوا کی جگہ ہو، اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ اخلاقی حیثیت سے درسگاہ ایک قسم کا سینی ٹوریم یعنی دار الصحت ہو جہاں فاسد جراثیم ہلاک ہو کر بیمار صحیح و تندرست ہو جاتا ہے،

ہمارے گھروں کی اخلاقی اور مزاجی کیفیت جس درجہ خراب اور فاسد ہے، اسی نسبت سے اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ ہماری درسگاہوں کا ماحول زیادہ صالح صحیح اور طاقت بخش ہو تاکہ گھروں کی مسموم فضا سے علٰحدہ ہو کر رفتہ رفتہ ان افراد کی تخلیق ہو جو صحیح شخصی، انسانی اور قومی اخلاق و خصائل کے حامل ہوں، اور اس طرح ایک دن وہ آئے کہ پوری قوم کی قوم ان اخلاق و فضائل سے متصف اور مزین ہو جائے،

۱۔ سادگی اور صفائی

ہماری درسگاہوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو سادہ لیکن صاف ستھرا رہنے کی اہمیت ذہن نشین کریں، صاف ستھرا رہنے کے معنی بیش قیمت کپڑے، اعلیٰ درجے کے مکان اور قیمتی فرنیچر اور سامان کے نہیں ہیں، افسوس ہے کہ اکثر مسلمان بچوں نے اس کے یہی معنی سمجھے ہیں، اس کے دو بڑے نتیجے کھلے طور سے ہمارے بچوں میں پیدا ہیں، ایک یہ کہ وہ اپنی اندرونی صفائی کے بجائے ظاہری ٹیپ ٹاپ پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اس بنا پر ان کی تعلیمی زندگی نہایت گراں ہے اور وہ اپنے والدین کے لئے سراسر کوفت بنے ہوئے ہیں، دوسرے خود طالب علم بھی اپنے حوصلہ کے مطابق اپنی آمدنی نہ پانے سے ملول و غمگین رہتے ہیں، جس کا اثر ان کی طبیعت کی تیزی اور ذکاوت پر بہت برا پڑتا ہے، اور ان کا جو وقت اپنے تعلیمی مسائل اور مباحث کے یاد اور حل میں صرف ہوتا وہ ان کے بناؤ سنگار میں، اور جو نہیں ہے اس کے حصول کی فکر اور ناکامی کے غم میں بسر ہوتا ہے

ہمارے طالب علموں کی زندگی سادہ لیکن صاف ستھری ہونی چاہئے، ان کو شروع ہی سے یہ بتانا چاہئے کہ تمھاری عزت تمھارے بیش قیمت کپڑوں اور اعلیٰ سامان سے نہیں بلکہ تمھارے بیش قیمت علم اور اعلیٰ اخلاق سے ہے، طالب علموں کے اندر بڑائی اور مسابقت کا معیار ظاہری نمایش اور آرایش کا سامان نہ ہو بلکہ اندرونی لیاقت اور قابلیت کا جوہر ہو،

مسلمان طالب علموں کو جو مسرف اور نمایش پسند قوم کے افراد ہیں، خصوصیت کے ساتھ یہ بات جتانی چاہئے کہ اب وہ وقت نہیں کہ ہم اپنے اسلاف کے بقیہ متمولانہ اثرات کی پیروی میں وہ گراں نمایشی زندگی اختیار کریں جو ہم کو اپنے والدین سے ورثہ میں مل رہی ہے، کیونکہ وہ دولت ختم ہو چکی اور وہ تمول اب سراب ہے، اس لئے اس کے نمایشی فخر وغرور کے اسباب کو بھی ختم ہو جانا چاہئے، ورنہ تعلیم ہمارے افلاس میں روز بروز اضافہ کرتی جائے گی اور قوم

کی حالت ہر روز بد سے بدتر ہوتی جائے گی، اس کی مثالیں آج بہت سے خاندانوں میں ملینگی کہ نئی تعلیم کی اس غلط تربیت نے ان خاندانوں کی مالی حالت کو کتنا نقصان پہنچایا ہے،

دنیا کے دوسرے ملکوں سے بہت بڑھ کر ہندوستان کے مسلمانوں کو اس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے کہ وہ ایسی قوم کے دوش بدوش چلنے پر مجبور ہیں جو روزمرہ کی زندگی میں حد درجہ کفایت شعار اور سادہ واقع ہوئی ہے، اس لئے اس کے ذاتی اور قومی مصارف ہمارے مقابلے میں بہت کم ہیں، بنابریں اس کے پاس ہمارے مقابلے میں دولت کی فراوانی ہے، اور نتیجہ یہ ہے کہ جس خرچ میں ہم اپنے ایک بچے کو تعلیم دلا سکتے ہیں ہمسایہ قوم اپنے کئی بچوں کو تعلیم دلاتی ہے پھر دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ ہم اپنے فضول کاموں کے لئے اپنے بزرگوں کی متروکہ جائدادوں کو قرض میں رہن رکھکر بیچنے پر اور وہ اس کے خریدنے پر مجبور ہیں،

آجکل عام طور سے یہ دیکھا جارہا ہے کہ ہماری درسگاہیں اپنی عمارت، اپنے سامان اور اپنے انتظامات میں بیش از بیش نمایش پسندی میں مبتلا ہیں، ہماری گذشتہ تعلیم کے عہد میں ہماری مسجدیں ہمارے تعلیمی کمرے اور ہال اور مسجد کا فرش ہماری میزیں اور بنچیں اور کرسیاں تھیں، صرف انہی دو مدوں کی کفایت کا اندازہ موجودہ گراں طریقہ تعلیم سے بہ آسانی کیا جاسکتا ہے، اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہماری بہتر سے بہتر درسگاہ بہتر سے بہتر مقصدوں کے ساتھ قائم ہوتی ہے، لیکن اس کے بانیوں کی ساری محنت زمین، اینٹ اور چونے پر صرف ہو کر رہ جاتی ہے اور ان مبادی سے نکل کر غایت تک پہنچنا محال ہو جاتا ہے،

ہمارے دار الاقاموں میں سب سے بہتر دار الاقامہ وہ سمجھا جاتا ہے جو اپنے طالب علموں کو سب سے بہتر اور قیمتی کھانا بہم پہنچائے اور ان کے رہنے کے لئے بہتر سے بہتر سامان اور کمرے مہیا کرے حالانکہ یہ تمامتر ہمارے پچھلے تماشائے دولت کا فریب نظر ہے اور یہی وہ عیش و تنعم اور ناز و نعمت کی زندگی

ہے جو ہماری تباہی کی تمامتر ذمہ دار ہے،

ان سب کے بجائے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ سادگی اور صفائی ہے، ہمارے نوجوانوں نے صفائی، اچھے کپڑوں، فیشن ایبل بالوں، خوشبو، عطروں اور تیلوں کا نام رکھا ہے حالانکہ وہ حقیقت میں گھر کی صفائی، کمروں کی صفائی، کپڑوں کی صفائی اور بدن کی صفائی کی دولت سے محروم ہیں، طالب علموں کو اس بات کی عادت سکھانی چاہئے کہ وہ کیونکر اپنا کمرہ، اپنا سامان، اپنے کپڑے اور بدن کو صاف رکھیں، جس سے وہ جسمانی و ذہنی صحت اور وہ صفائی اور ستھراپن جو نصف دین اور اصلی تمدن ہے حاصل کریں،

۲- جفاکشی

اس کے بعد وہ سب سے بڑا اخلاقی جوہر جس کے حصول پر ہندوستان میں مسلمانوں کی آیندہ زندگی موقوف ہے جفاکشی ہے، ہم نے اسلامی اصطلاحات میں "جہاد" کا نام سنکر اپنی روشن خیالی کے ثبوت میں کتنی دفعہ اس سے تبری ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اے عزیزانِ محترم! اب وقت ہے کہ ہم جہاد کی حقیقت کو عملاً سمجھیں اور برت کر دکھائیں، جہاد جہدؔ سے مشتق ہے جس کے معنی محنت اور تکلیف کے ہیں، حق کی راہ میں ہم جو تکلیف اٹھائیں وہ ہمارا جہاد ہے، دنیا کی زندگی سکون پر نہیں، دائمی حرکت پر قائم ہے، غلط فہمی سے ہم یہ سمجھے ہیں کہ ہم جس قدر سکون پائیں گے اسیقدر آرام اٹھائیں گے، پچھلے عہد کے ایک عجمی شاعر نے کہا ہے،

بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر تفاوت را — دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن

لیکن حقیقت میں یہ زوال پذیر قوم کا فلسفہ ہے، راحت کے اس عجمی تخیل کے بالمقابل فصیح عرب کہتا ہے "فی الحرکۃ برکۃ" جس طرح بھوک کے بعد غذا کا اصلی لطف ملتا ہے، اور جو آنکھیں بیدار رہی ہیں وہی خواب کی لذت سے آشنا ہوتی ہیں، اسی طرح محنت و مشقت کے بغیر آرام و راحت کا وجود

ہی نہیں ہو سکتا، جب تک ہماری پیشانی سے محنت کا پسینہ ہمارے پاؤں پر نہ ٹپکے گا، جو روٹی ہمارے ہاتھ آئیگی وہ ہمارے احساس کے ذائقے کو بھی تسکین نہیں دے سکتی،

سست امیروں کی پر لطف غذائیں ہی وہ جراثیم ہیں جو ان کی بیماریوں کو پیدا کرتے ہیں، ایک محنتی مزدور چونکہ پوری بھوک اور معدے کی پوری خواہش پر کھاتا ہے اس لئے ہر وہ کھانا جو اس کو وقت پر مل جاتا ہے، وہ اس کی قوت کا سرمایہ اور اس کی صحت کا خزانہ ہوتا ہے،

مسلمانوں کو بچپن سے محنت کا عادی ہونا چاہئے، ان کی طالب علمانہ زندگی میں یہ عادت ایسی پختہ ہو جانی چاہئے کہ وہ تمام عمر کے لئے اس دولت کو اپنے قبضہ میں کر لیں، تعلیم، امتحان کی تیاری، ورزش، سفر اور تعلیم سے فراغت کے بعد جس شاہراہِ زندگی کو بھی اختیار کیا جائے خواہ وہ نوکری ہو، تجارت ہو، صنعت ہو ہر ایک میں یہی جوہر ان کا بہترین رفیقِ زندگی ہو سکتا ہے، پچھلی دولتمندی کا خمار اب تک مسلمانوں پر چھایا ہوا ہے، ہماری درسگاہوں کا بہترین فرض یہی ہے کہ وہ مسلمان طالب علموں کے یہ ذہن نشین کر دیں کہ اب تمھاری زندگی صرف تمھاری محنت، جفاکشی اور جانفشانی پر موقوف ہے، یہ دنیا ایک تلاطم خیز سمندر ہے جس سے نکل کر ساحل تک بہ سلامتی پہنچنا صرف تمھارے ہی ہاتھ پاؤں چلانے پر موقوف ہے،

کون نہیں جانتا کہ اس عرصۂ کائنات میں زندگیوں کا ایک معرکہ برپا ہے اور ہر ایک مخلوق اپنے جینے اور بڑھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے، قومیں اس دوڑ میں مصروف ہیں، افراد اس مسابقت میں سرگرم ہیں، وہی زندہ اور جیتا رہے گا، جو اپنی محنت اور کوشش سے اس بازی کو جیتے گا اور جس نے ہاتھ پاؤں ڈال دیئے اور نرم بستر کا جویا ہوا، دنیا اس کو مردہ سمجھ کر ایک گوشے میں ڈال دے گی، اور افراد اور قومیں اس کو روندتی ہوئی آگے بڑھ جائیں گی، زندگی کا فلسفہ صرف جہد و جہاد محنت اور سخت کوشی ہے، بھوک کی برداشت، شکم سیری کا سامان ہے، اور موت کی تلاش زندگی

کا سرچشمہ ہے، انی اقتل فی سبیل اللہ ثم احیا ثم اقتل ثم احیا الخ

جو کچھ کہا گیا شاعری نہیں، روزمرہ کی حقیقت ہے، طالب علموں کو اپنے روزانہ کے ورزشی کھیلوں میں کیا یہ راز ہر شام کو علانیہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہی لڑکا جیتتا اور وہی فریق کامیاب ہوتا ہے جو جس قدر اس دن زیادہ محنتی اور زیادہ جفاکش تھا، یہ پوری دنیا ایک بڑے ورزشی کھیل سے بڑھ کر نہیں، اس میدان میں بھی اسی کی جیت ہے جو زیادہ جفاکش ہے، کامیابی کی راحت ان ہی کے لئے ہے جو اپنے کاروبار میں محنت اور جدوجہد کی تکلیف اٹھاتے ہیں،

تمام قوموں میں سب سے زیادہ کامیاب، سب سے زیادہ خوش قسمت اور سب سے زیادہ قابل رشک وہ قوم سمجھی جاتی ہے جس کے ہاتھوں میں دوسری قوموں کی سلطنت کی باگ ہو، لیکن کیا تاریخ کے اوراق نے اس حقیقت کو آپ پر منکشف نہیں کیا کہ یہ کامیابی، یہ خوش قسمتی اور یہ قابل رشک ہونے کی صلاحیت اس کو کتنی محنت، کتنی جفاکشی اور کتنی پے درپے جسمانی تکلیفوں اور اذیتوں کی برداشت کے بعد حاصل ہوئی ہے، محمود نے سترہ حملوں میں پنجاب پر قبضہ پایا، شہاب الدین غوری نے ایک شکست کے بعد پورے سال بھر اپنے شکست کے وقت کے پہنے ہوئے کپڑوں کو تبدیل نہیں کیا، بابر نے کامل پندرہ برس پہاڑوں سے سر ٹکرایا، میں نے ان فقروں کو ہمیشہ کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ بدر و حنین کی سختیوں کو جھیلے بغیر قیصر و کسریٰ کے تخت سلطنت کی خواہش حماقت ہے جس کو لال قلعے میں شاہجہاں کے تخت طاؤس پر جلوس کی ہوس ہو اس کو پہلے بابر کی طرح خشک پہاڑیوں میں سر مارنا چاہئے، کوہ کنی کے بغیر جوئے شیر کا خواب دیکھنا دیوانگی ہے،

آج یورپ کی قومیں دنیا کے طول و عرض میں سلطنت کا تخت بچھائے کوس لمن الملک بجا رہی ہیں، لیکن اپنے سپاہیوں کے کتنے خون، اپنی دولت کے کتنے صرف اور اپنی محنت و جانفشانی کے کتنے مظاہرے کے بعد یہ سعادت ان کو نصیب ہوئی ہے، آج تجارتوں، صنعتوں اور کاریگر…

کی زندگی ہے، یہ زندگی کتنی زندگیوں کی قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی ہے، کروڑوں مزدور کان کنی میں لگے ہیں، لاکھوں آلات کے بنانے اور چلانے میں مصروف ہیں، لاکھوں دن رات دوڑ دھوپ اور محنت اور تگ و پو میں منہمک ہیں، تب جاکر ان کی قوم کے سر پر سلطنت کا تاج ہے اور ان کے خزانوں میں معدنیات، تجارت اور صنعت و حرفت کی دولت ہے،

بابر سے لے کر عالمگیر اول تک اور پھر بہادر شاہ اول سے لے کر بہادر شاہ ثانی آخری مغل بادشاہ دہلی تک کی زندگیوں پر غور و فکر کی نظر ڈالئے، کیا تین سو برسوں کی یہ تاریخ یہ حقیقت نہیں بتاتی کہ جنھوں نے تکلیف کی زحمت اٹھائی انھوں نے تخت سلطنت پر آرام کیا، اور جنھوں نے آرام کی خواہش کی انھوں نے عمر بھر زحمتوں اور تکلیفوں میں بسر کی،

الغرض مسلمان طالب علموں کو یہ نکتہ اب کبھی فراموش نہ کرنا چاہئے کہ محنت اور جفاکشی ہی کی عادت وہ چیز ہے جو ان کی تعلیمی اور عملی دونوں زندگیوں میں ان کو کامیاب بنا سکتی ہے، جہاں قومی سلطنتیں اور قومی تعلیمگاہیں ہیں وہاں کے نظام تعلیم پر ذرا غور کرنے سے یہ نکتہ حل ہو سکتا ہے کہ ان کے نصاب تعلیم میں جو اہمیت کتابوں کو حاصل ہے اس سے کم اہمیت ان کے جسمانی کھیلوں اور مختلف ورزشوں کو حاصل نہیں ہے، میدانی کھیلوں کے علاوہ پہاڑوں پر چڑھنا، دریاؤں میں کشتی چلانا، دھوپ میں دوڑنا، ہواؤں میں اڑنا وہ کونسی جانفشانی ہے جس کی مشق یہ قومیں اپنے حکمراں بننے والے افراد کو نہیں کراتیں، انگلستان کی بہترین درسگاہوں کے دیکھنے کا موقع ملا ہے، اور یہ نظر آیا ہے کہ ان ورزشی کھیلوں کی اہمیت وہاں تعلیم کے برابر ہی برابر ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہاں کی عام تعلیمگاہیں بھی تقریباً نیم فوجی ہیں، اسی سے ہندوستان کی تعلیم کا یہ نقص کہ وہ تمامتر نظری رہتی ہے، عملی نہیں، وہاں دور ہو جاتا ہے، مسلمانوں کو اگر آیندہ ہندوستان کی سلطنت میں حصہ لینا ہے تو ان کو یہ نکتہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ آیندہ ان کو صرف نظری نہیں بلکہ عملی قوم بننا چاہئے

اور یہ اخلاقی تربیت کے بغیر ممکن نہیں،

۳- خود اعتمادی

مسلمانوں کی اخلاقی تعمیر کا نہایت اہم عنصر اپنے افراد کے اندر خود اعتمادی کا جوہر پیدا کرنا ہے جس کے بغیر نہ کوئی فرد کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ کوئی قوم، خود اعتمادی سے مقصود اپنے اندر فیصلے کی قوت سے مستحکم عزم پیدا کرنا اور پھر اس عزم کے مطابق خدا کے بعد خود اپنی ذات پر بھروسہ کرکے کام شروع کر دینا اور اس کو کامیابی تک پہنچانا ہے، قرآن پاک نے اس نکتے کو صرف دو لفظوں میں ادا کیا ہے" اِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ" (جب عزم کرے تو پھر خدا پر بھروسہ کر) اس سے پہلے مشورے کا حکم ہے، مشورے کے بعد جو فیصلہ ہو جائے اس پر مستحکم عزم کی تاکید ہے، پھر اس عزم کے مطابق اس کو کر گذرنا اور اس کی کامیابی کے لئے خدا کی توفیق اور نصرت پر بھروسہ رکھنا،

مسلمانوں کا یہی جوہر تھا جس سے متصف ہو کر ایک غریب مسافر ہمت کی کمر باندھ کر تن تنہا کھڑا ہوتا تھا اور بحر و بر، دشت و جبل کو طے کرکے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کو چلا جاتا تھا، ایک یتیم طالب العلم گھر سے یکہ و تنہا نکلتا تھا اور سالہا سال تک ملک ملک کی خاک چھان کر ایک ایک شہر میں علم و فن کے ماہرین وقت کی صحبتوں اور درسگاہوں سے فیض پا کر اپنے وطن کو لوٹتا تھا، ذرہ ہو کر نمودار ہوتا اور پھر آفتاب بنکر چمکتا تھا، ایک باہمت سوداگر اکیلا اپنا ساز و سامان لے کر کبھی سندباد بحری اور کبھی سندباد بری بنکر نکلتا تھا اور دولت کے جہاز اور کارواں سے لدا پھندا عراق، شام، اسکندریہ اور اسپین کی بندرگاہوں میں اترتا، ایک معمولی سپاہی اپنی تلوار لے کر نکلتا اور روے زمین کی فضا کو چیر کر کہیں نہ کہیں اپنے لئے ایک حکومت و ریاست کھڑی کر لیتا،

مسلمانوں کا یہ جوہر اٹھارہویں صدی کے ہندوستان میں ان سے کھو گیا، یہ سنکر حیرت ہوگی کہ وہ بابر جس نے پندرہ برس کے سن میں تخت پر بیٹھ کر اور پھر بارہ ہزار فوج سے ہندوستان

کو فتح کر ڈالا، اس کی اولاد جب لال قلعہ سے بھیڑ کی طرح نکلی ہے تو اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کس طرح اپنے ہاتھوں سے اپنی روزی کا سامان کیا جا سکتا ہے،

والدین اپنے بچوں کے ساتھ اپنی بہترین محبت یہ سمجھتے ہیں کہ انکو تنہا کوئی کام کرنے نہ دیں تنہا راستے میں نہ چلیں، راتوں کو اکیلے گھر سے باہر نہ نکلیں، کمروں میں رات کو تنہا سونے نہ پائیں، ایک بڑے عالم باپ کو میں نے دیکھا کہ اپنے جوان بیٹے کو کالج کی تعلیم کے لئے لکھنؤ اس لئے نہیں جانے دیتے تھے کہ یہ کالج میں پڑھنے جانے والا بچہ کہیں آتے جاتے راستے میں موٹروں سے کچل نہ جائے امیر مسلمانوں کے گھروں میں یہ بات دولتمندی کی نشانی سمجھی جاتی ہے کہ انائیں اور کھلائیاں جوان جوان لڑکوں سے بھی علحدہ نہ ہونے پائیں، اٹھارہ انیس سال کے ایسے نواب زادوں کے واقعے سنے ہیں جن کو اس وقت نیند نہیں آتی تھی جب تک ان کی انا بی بی ان کو پلنگ پر سلاتی نہ ہوں، آپ نے ایسے نواب زادوں اور امیر زادوں کو دیکھا ہوگا جو کسی درسگاہ کے دارالاقامے میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ ان کو ناگہانی اتفاقات سے بچانے کے لئے اسٹاف کا اسٹاف ہوتا ہے،

غریب مسلمانوں تک میں یہ بات عموماً دیکھی جاتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو خود تنہا اپنے کام کی ذمہ داری اٹھانے کی زحمت دینے پر بہت کم رضامند ہوتے ہیں، یہی سبب ہے کہ ہمارے بچے عزم و ارادے کے کچے، ہمت کے بودے اور استقلال کے کمزور ہوتے ہیں، اور اس لئے تعلیم کے زمانے کے اندر اندر بھی وہ اتالیق اور ٹیوٹر کے سہارے کے بغیر نہیں چل سکتے، اور تعلیم کے بعد بھی اپنے بل بوتے پر کھڑے نہیں ہو سکتے، الغرض وہ بچپن میں انا اور کھلائی کے، تعلیم میں اتالیق اور ٹیوٹر کے اور ملازمت میں سعی و سفارش کے محتاج ہوتے ہیں، زندگی کے ہر ہر مرحلے میں ہر قدم پر ان کو اس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ وہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر چلیں

ایسی قوم کے افراد کیا حکومت کی بلند چوٹی پر چڑھنے کی ہمت کر سکتے ہیں؟ کیا اسلامی ہندوستان کی تاریخ ہمارے سامنے نہیں، ان کی ترقی کا جب عہد تھا بادشاہ کے زیر سایہ امرا کھڑے ہو کر ملک کا انتظام کرتے تھے اور ان کے تنزل کا زمانہ جب آیا تو یہ شہزادے اپنے اپنے امیروں کے سہارے کھڑے ہو کر تخت پر بیٹھنے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان امیروں نے ان کو اٹھا کر تخت سے دور پھینک دیا اور بالآخر تخت اور تخت نشین دونوں کا خاتمہ ہو گیا،

یورپ کی ترقی یافتہ قوموں کے افراد میں آج یہ جوہر ان کی ان ہی درسگاہوں میں پیدا ہوتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جس پرزے کو جہاں لگا دیجئے وہیں وہ کام دینے لگتا ہے، ایک فرنچ مصنف نے اینگلو سکسن قوم کی ترقی کے راز پر فرنچ میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ عربی میں "سر تقدم الانکلیز السکسونیین" کے نام سے ہوا ہے، اس میں زیادہ زور اسی بات پر دیا گیا ہے کہ انگریز قوم کی ترقی کا بڑا راز یہی خود اعتمادی کا جوہر ہے، ایک اور فرنچ نے "بیسویں صدی کا امیل" کے نام سے خطوط کی صورت میں ایک کتاب لکھی ہے، اس میں بھی بڑی خوبی سے یہ دکھایا گیا ہے کہ ماں کے گود سے لے کر کالج کی اعلیٰ تعلیم تک لڑکوں میں جس وصف کے پیدا کرنے کی کوشش کیجاتی ہے وہ خود اعتمادی ہے، ایک انگریز سپہ سالار کا یہ فقرہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "ہم نے انگلستان کے فٹ بال کے میدانوں میں خود اعتمادی اور ثبات و استقلال کا جو جوہر اپنے اندر پیدا کیا تھا وہی نپولین کے مقابلے میں ہمارے کام آیا"

مسلمان ہندوستان میں جس تعدادی اقلیت میں ہیں اس کی تلافی صرف ان کی اخلاقی قوت اور عقلی طاقت سے ہو سکتی ہے، اس لئے ہماری درسگاہوں کو اس ملک کے مسلمانوں کو آیندہ زندگی بخشنے کے لئے ضرورت ہے کہ وہ اپنے طالب علموں میں یہ قوت اور یہ طاقت پیدا کریں، تاکہ وہ اپنے استحقاق سے اس ملک میں زندہ رہ سکیں اور اس مملکت کے نظام

حکومت کے قیام اور استواری میں کسی طرح ان سے حکومت وقت کو بے نیازی نہ ہو سکے،

اساتذہ ہماری درسگاہوں میں جس چیز کی طرف سب سے کم توجہ کیجاتی ہے وہ استادوں کے انتخاب کا مسئلہ ہے، قومی درسگاہوں میں اس انتخاب کا معیار یہ ہے کہ جو کم تنخواہ لے، اور سرکاری درسگاہوں میں یہ کہ جو سب سے اونچی کاغذی سند رکھے اور "یورپین کوالیفیکیشن" تو وہ منتر ہے جس سے ہر تعلیمی بھوت بآسانی بھاگ جاتا ہے، ہندوستان کا کیسا ہی تجربہ کار سے تجربہ کار ماہر سے ماہر اور محقق سے محقق ہو لیکن اگر اس کے پاس یورپ کی کسی درسگاہ کے دو نفظانہ ہوں تو اس کے مقابلے میں بیرونی تعلیم کا ہر ناتجربہ کار و نو آموز ترجیح پائے گا، ہماری بڑی سے بڑی یونیورسٹی آج انگریزی، فرنچ اور جرمن استادوں کے ناموں کے جادو میں گرفتار ہے اور اس کی منہ مانگی تنخواہ دینے میں حاتمانہ فیاضی کے لئے تیار ہے،

اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک ہم نے اپنی تعلیم کا کوئی نصب العین مقرر نہیں کیا ہے، بلکہ خود قوم نے بھی اپنی زندگی کا کوئی مقصد قرار نہیں دیا ہے، اس لئے استادوں کے انتخاب کا معیار صرف یہ رہ گیا ہے کہ اعلیٰ سند کا کاغذ اور سات سمندر پار کے حکمراں اقوام کی گوری شخصیت، انتہا یہ ہے کہ عربی فارسی اور تصوف کے پڑھانے کے لئے بھی ہم اپنی قوم کے کسی فرد پر اعتبار کرنے کے لئے اس وقت تک تیار نہیں جب تک پروفیسر مارگولیتھ، پروفیسر براؤن، ڈاکٹر آرنلڈ اور ڈاکٹر راس کے دستخطوں کا کاغذ اس کے پاس نہیں،

ہم نے اس سے پہلے مسلمانوں کے تعلیمی مقاصد کا جو خاکہ آپ کے سامنے پیش کیا ہے اگر وہ ذہن نشین ہے تو آپ اس کا فیصلہ کرنے میں ایک ذرہ بھی تامل نہ فرمائیں گے کہ استادوں کے انتخاب کا معیار کاغذی سند سے بڑھ کر ان کی شخصیت میں ان مقاصد کا وجود ہے، جن پر اس تعلیم گاہ کی بنیاد قائم ہے، اگر آپ کسی ایسی دو درسگاہوں کا باہم موازنہ کریں جنمیں سے ایک ایسے استادوں کا انتخاب رکھتی ہے جو اعلیٰ کاغذی سندوں کے تو مالک ہیں مگر ان مقاصد سے سر تا سر خالی ہیں اور دوسری

گو اعلیٰ کاغذی سندوں کے لحاظ سے کم درجہ ہے، مگر اس کے استاد اپنے اندر وہ جوہر رکھتے ہیں جو ایک تعلیمی مقاصد کا حقیقی عنصر ہیں تو یقیناً عملی حیثیت سے دوسری پہلی سے کہیں زیادہ مفید ہوگی، کیا ہماری نئی اسلامی درسگاہیں استادوں کے انتخاب کے وقت یہ معیار اپنے سامنے رکھتی ہیں کہ ان میں سے کون زیادہ مسلمان، کون زیادہ راستباز، کون زیادہ مخلص، کون زیادہ محنتی، کون زیادہ جفاکش اور کون حقیقت میں مسلمانوں کے تعلیمی نصب العین کے پورا مطابق ہے؟ کیا کسی غیر قوم کے استاد سے یہ توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ دوسری قوم کے حقیقی تعلیمی نصب العین کے مطابق اپنے کو بنا لیگا اور خود اس کا نمونہ بن کر طلبہ کے سامنے آئے گا؟ ایسے استادون کے زیر تعلیم و تربیت جن میں سے ہر ایک کا قبلہ مقصود صرف دوسری قوم کی ظاہری نقالی ہو، اور جن کا حوصلہ صرف سوٹ، کوٹھی، فرنیچر اور موٹر تک محدود ہو، ایسے لڑکوں کے پیدا ہونے کا خواب دیکھنا جو مسلمان ہوں، اقوام ہوں، سادہ ہوں، جفاکش ہون، اور اقوام کی دوڑ میں اپنی برتری دکھا سکیں، کہاں تک حق بجانب ہے؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی احمق کاشتکار اپنے کھیتوں میں جو بو کر گیہوں کاٹنے کی امید رکھے، اور اس سے بے خبر ہو کر کہ ع

گندم از گندم بروید جو ز جو

اسلامی اور وطنی نصب العین کا جو خاکہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے، اور جس کو مسلمان اپنا قومی مقصد اور زندگی کا مطلوب بنالیں وہی درحقیقت استادوں کے انتخاب کا معیار ہے،

بوریا باف گرچہ بافندہ است ۔۔۔ نہ برندش بہ کارگاہِ حریر

ہماری پچاس برس کی تعلیمی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے پہلے تو اپنا کوئی تعلیمی مقصد متعین نہیں کیا اور نہ اس مقصد کے مطابق اپنے استادوں کا انتخاب کیا، مثال دیتا ہوں ہم نے عربی پڑھانے کے لئے یورپ کے ایک بہترین مستشرق کو بلوایا وہ عربی فیلالوجی اور یورپین

عربی مطبوعات و مخطوطات کی پوری فہرست ہمارے بچوں کو رٹا سکتا ہے، مگر قرآن پاک کا وہ شغف اور تاریخ اسلام کا وہ ذوقِ قومی ہم کو کیوں کر عطا کرسکتا ہے جو نہ صرف یہ کہ اس کو نصیب نہیں بلکہ وہ اس سے منحرف ہے،

ہماری اکثر درسگاہوں کے استاد صرف پیشہ ور معلم ہیں، جنھوں نے اس پیشے کو صرف اس لئے اختیار کیا ہے کہ یہ بھی معیشت کا ایک ذریعہ ہے، ورنہ درحقیقت وہ ہمارے قومی مقاصد، تعلیمی نصب العین اور اسلامی ذوق سے سراسر محروم ہیں اور پھر ان سے ہم یہ احمقانہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ آیندہ ہمارے بچوں کو ہمارے قومی مقاصد، تعلیمی نصب العین اور اسلامی ذوق سے بہرہ ور کردیں گے،

جامعہ ملیہ کو میں مبارکباد دیتا ہوں کہ اس نے اپنے استادوں کے انتخاب میں اس نکتے کو پیش نظر رکھا ہے، اس نے انتخاب کا معیار اعلیٰ کاغذی سند کو نہیں بلکہ اپنے تعلیمی مقاصد کو قرار دیا ہے، فرض کیجیے کہ اگر اس درسگاہ میں ایک نہایت اعلیٰ قسم کے ایسے استاد کو لاکر رکھدیا جائے جو گو یورپین اسناد کی بڑی پوٹ اپنے قبضے میں رکھتا ہو، مگر اس کے تمامتر حالات و خیالات اور نشر و تعلیم ان مقاصد کے خلاف ہوں جن پر اس درسگاہ کی بنیاد ہے، تو کیا ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب اس کو "جامعہ بدر" کرنے میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے فضل و کمال کے ان کاغذی دستاویزات کا پاس کریں گے؟ پھر کیا ہے کہ ہماری درسگاہوں کے معلم اپنے وجود، اپنی تعلیم اور اپنے فیض صحبت سے علانیہ ہمارے قومی مقاصد کی تفضیحک، ہمارے مذہبی خیالات کی توہین اور ہمارے وطنی اغراض کی تلبیس کرتے ہیں اور یہ صرف اس لئے گوارا کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس کاغذی دستاویزات کا اچھا ذخیرہ موجود ہے،

چو ہست طینتِ آدم ز خمیرِ دگر است ۔۔۔ تو توقع ز گلِ کوزہ گراں می داری

ارکانِ جامعہ سے بھی ایک بات کا برملا اظہار کردینا ہے، ہم نے اب تک جامعہ ملیہ کو اسلامیت و وطنیت اور جدید و قدیم دونوں کی معتدل اور لطیف آمیزش کا نتیجہ سمجھا ہے، اسی لئے

اساتذہ کے انتخاب میں صرف "اخلاص و ایثار" کی سند اتنی زبردست نہیں کہ اس کے لئے اسلامیت کی نفی کر دیں، یا وطنیت سے انحراف پسند کریں، اگر وطنی اغراض کے مخالف کو اس جامعہ میں مسلم نہیں باقی رہنا چاہئے، تو اسلامی اغراض کے مخالف کے لئے رواداری کیوں برتی جائے، اگر کوئی درسگاہ اس قسم کی رواداری برتتی ہے تو درحقیقت وہ اپنے مقاصد کی جڑ پر آپ کلہاڑی مارتی ہے، بہرحال اس بات کے اظہار میں ہم کو کوئی پس و پیش نہیں کہ ہماری یہ نوعمر درسگاہ اس اصول کو بہت کچھ اپنے سامنے رکھتی ہے، اور دعا ہے کہ اس کے کارکنوں کو اپنے معیار کی سختی پر مزید استقامت نصیب ہو،

علوم ہم کو اپنی درسگاہوں میں کن علموں کو پڑھنا اور پڑھانا چاہئے؟ یہ وہ سوال ہے جس پر اب تک مسلمانوں نے کیا بلکہ ہندوستانیوں نے بھی غور نہیں کیا، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ہم ڈیڑھ سو برس سے جس تعلیمی شکنجے میں گرفتار ہیں، اس سے مجبور رہ کر ہم اس پر غور کر بھی نہیں سکتے، ہندوستان میں نئی تعلیم جن اسباب سے پھیلائی گئی ہے ان کو بیان کرنے میں برطانی مدبرین نے کبھی پس و پیش نہیں کیا ہے،

(۱) سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہندوستانیوں کے دلوں سے اپنی تہذیب و تمدن اور دین و مذہب کی عصبیت مٹ جائے، اس کے لئے اس کی ضرورت تھی کہ نصاب تعلیم کو ہر مذہبی اسپرٹ سے خالی رکھا جائے، یہاں تک کہ اس میں خدا کا نام بھی نہ آنے پائے،

(۲) بنگال کی ابتدائی مثالوں سے انگریزوں کو یہ دھوکا ہوا کہ یہ تعلیم عیسائیت کی اشاعت میں معین ہوگی، اسی لئے گورنمنٹ کی طرف سے مشنری اسکولوں کی پوری حوصلہ افزائی ہوئی اور ان میں انجیل کی تعلیم داخل کیگئی،

(۳) انگریزوں کو اپنی حکومت کی تنظیم میں ایسے ماتحتوں کی ضرورت تھی جو ان کے دفتروں کے لئے کچے مواد اور مسالوں کو ان کے مطالعہ تجویز اور فیصلے کے لئے مرتب کر سکیں اور ان کو ان کی زبان میں معاملے کی صورت حال کو سمجھا سکیں،

ان وجوہ سے جدید درسگاہوں کو پہلے تو مذہبی اور اخلاقی تعلیم سے یکسر خالی رکھا گیا، پھر ان میں صرف ان ہی علوم کو داخل کیا گیا جو اس قسم کے ادنی تعلیم یافتوں کو ان کے لئے مہیا کر سکے، ایسے محرروں، کلرکوں اور ماتحت افسروں کو سب سے پہلے تو انگریزی جاننا چاہئے تاکہ وہ ان کی زبان میں سلطنت کے معاملات اور کاغذات کو پیش کر سکیں، پھر ان کو حساب جاننا چاہئے جو ان کے دفاتر کے حساب و کتاب کو درست رکھ سکیں، چنانچہ جو نئی تعلیم ہندوستان میں جاری کی گئی، اس کی اصلی بنیاد یہی دو چیزیں ہیں، انگریزی اور حساب، اس کے ساتھ تیسری چیز جغرافیہ ہے، جس سے مقصود صرف اس قطعۂ ارض کا علم ہے جہاں سے آفتاب کبھی نہیں ڈوبتا، اور اس سے اس سلطنت کی وسعت اور عظمت کے ساتھ اس کے مختلف ٹکڑوں کا جوڑ بھی معلوم ہو، چوتھی چیز تاریخ ہے جس کا مقصد اس ملک کی قوموں کے باہمی دشمنانہ تعلقات کی یاد کو ان کے دلوں میں تازہ رکھنا، اور انگریزوں نے جیسا کہ وہ کہتے ہیں اس ملک میں ایک نظم عادل اور متمدن حکومت قائم کر کے اہلِ ملک پر جو احسان کیا ہے اس کو بار بار دھراتے رہنا ہے، چنانچہ حکومتِ وقت اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئی اور اس نے ہندو مسلمانوں کے درمیان بغض و عداوت کی وہ آگ بھڑکا دی جو ہماری بہترین کوششوں کے باوجود اب تک نہ بجھ سکی،

اعلیٰ تعلیم کے دو حصے ہیں، فنون یعنی آرٹس اور علوم یعنی سائنس، یہ دونوں حصے حد درجہ ناقص ہیں، آرٹس میں جن فنون کی تعلیم دی جاتی ہے ان کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ سلطنت کے لئے ماتحت افسر حاصل ہوں، ابھی حال میں پٹنہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر کورٹنی ٹیرل نے پٹنہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد میں جو خطبہ پڑھا اس میں انھوں نے یہ بالکل بجا کہا ہے:

"بی اے یعنی بیچلر آف آرٹس، کس قدر مغالطہ آمیز فقرہ ہے، وہ کونسا آرٹ ہے جس میں ایک بی اے مہارت حاصل کرتا ہے":

ے دیگر ایک تاریخ، دوسری انگریزی اور تیسری پولیٹیکل اکانمی جس کی مناسبت قانون خوانی
اور وکالت کے خیال سے ہے اور پھر نظری فلسفۂ علوم میں ایک عجیب ندرت یہ رکھی گئی ہے کہ
"نظریات" کو اہمیت دیجائے اور "عملیات" سے پہلو تہی کیجائے، ہماری ایک بڑی درسگاہ میں
سائنس کالج کی سب سے بڑی اہمیت علم حیوانات کی تعلیم ہے، حالانکہ ہم ابھی علم انسان سے بھی آشنا
نہیں، حیوانات کے خصائص اور زوجی فرائض کے علم سے بہتر ہمارے لئے یہ ہے کہ ہم یہ جانیں
کہ ان میں سے کسی کا چمڑا ہم کس طرح کام میں لاسکتے ہیں،

غرض ان بے عمل اور نظری علوم کی تعلیم سے ممکن ہے کہ موجودہ حکام تعلیم کا یہ مقصد ہو کہ تعلیم یافتہ
ہندوستانی اپنی زندگی گذارنے کے لئے حکومت وقت کے دست نگر رہیں تاہم یہ بھی اسی کا نتیجہ
ہے کہ جیسے جیسے یہ تعلیم بڑھتی جاتی ہے لکھے پڑھے اپاہجوں کی تعداد بھی روز افزوں ہے اور چونکہ
ہندوستان میں بے کاروں کے لئے کام مہیا کرنا حکومت کا فرض نہیں اس لئے اس کو اپنے طریق
تعلیم میں تغیر کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی،

حکومت کی ابتدائی تعلیمی پالیسی کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ہندوستان میں اور خصوصاً مسلمانوں میں
تعلیم کی ضرورت صرف نوکری کے حصول کے لئے ہے اور اب انقلابات نے ہماری آنکھوں سے
یہ پردہ اٹھا دیا ہے، کہ یونیورسٹیوں کی یہ تعلیم نوکریوں کے حصول میں بھی اب کارآمد نہیں رہی
ہے تو اب سوال یہ ہے کہ آخر پھر اسی تعلیم کے پیچھے اب تک دوڑے چلے جانا کہاں تک صحیح ہے؟
اگر اس تعلیم سے سرکاری نوکریوں کا سہارا بھی ہو تو بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ سرکاری نوکریاں قومی افلاس
کے دور کرنے کا علاج نہیں ہیں، وہ علوم وفنون جو حصول دولت کے اصلی ذرائع ہیں ان کی
تعلیم ہمارے نظام تعلیمات سے قطعاً خارج ہے، عملی کیمسٹری، آلات سازی اور صنائع وحرفت
کی تعلیم جن پر قومی روزی کا دارومدار ہے، ہمارے تعلیمی دائرے سے تمامتر باہر ہے، کہ اگر ان کی

تعلیم یہاں ہو تو پھر ہندوستان انگلستان کی مصنوعات کا بازار باقی نہ رہے، ڈاکٹری ہم کو یہاں
سکھائی جاتی ہے مگر دواسازی نہیں کہ اگر ایسا ہو تو پھر دواؤں کی قیمت میں ہندوستان اپنا سرمایہ
انگلستان کو دینے پر کیوں مجبور ہو،

اسکول کی پوری تعلیم میں سائنس کی تعلیم برائے نام ہی چھوئی جاتی ہے، جغرافیہ طبیعی حفظان
صحت اور طبیعیات کی دوسری چھوٹی چھوٹی باتوں کے سوا ان کو اور کچھ بتایا نہیں جاتا اور ٹوٹی
پھوٹی انگریزی لکھنے اور بولنے اور حساب جوڑنے کے سوا کچھ اور ان کو نہیں آتا، کالجوں کی اعلیٰ
تعلیم میں انہی خاکوں کو اور زیادہ ابھار دیا جاتا ہے، افسوس ہے کہ ان مسائل پر پوری طاقت
سے گفتگو کرنے کے لئے میں اپنے میں اہلیت نہیں پاتا، اس لئے تفصیلات کو اپنے سے زیادہ لائق
اشخاص کے سپرد کر کے صرف چند سرسری اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں،

(۱) سب سے پہلے یہ کہ کیا یہ غیر مذہبی اور غیر قومی تعلیم آیندہ جاری رہنا چاہئے؟ کیا ایسا نصاب
تعلیم کے لئے زہر نہیں جو مذہب واخلاق اور قومی تخیل کی روح سے یکسر خالی ہو؟

(۲) کیا نفس انگریزی زبان کا یہ معیار تعلیم کہ ہر ہندوستانی خالص انگریزوں کی طرح اس
زبان میں لکھ پڑھ سکے اب بھی باقی رہنا چاہئے؟ یا اس قدر جاننا کافی ہے جس سے اس کے
ذریعہ گفتگو کاروبار اور حصول علم ممکن ہو،

(۳) علوم میں ان سائنسوں کو جگہ دی جائے جن سے ہم کو عملی فائدہ پہنچے اور وہ ہمارے
علم کے ساتھ ہماری دولت کو بھی بڑھا سکیں،

ہمارے بچوں کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ گھڑی سے وقت کیونکر پہچانیں، ٹکٹ لے کر
ریل پر کیونکر بیٹھیں اور ایک موٹر کا عام استعمال کیونکر کریں، تار لکھ کر بابو کے ذریعہ تار
کیونکر بھیجیں، لیکن یہ نہیں پڑھایا جاتا کہ ہم گھڑی کیونکر بنائیں، لوہے کو مٹی سے کیسے نکالیں،

پھر لوہے کو کیسے صاف کریں، پھر کیوں کر ریل کی پٹریاں اور گاڑیاں اور پہیئے اور انجن بنائیں، موٹر کے ٹکڑوں اور ان ٹکڑوں کو کیسے بنا کر جوڑیں، اسی مثال پر دوسری باتوں کو قیاس کیجئے،

ہم اب تک پوری تیزی کے ساتھ اسکول کی تعلیم کے بعد کالج کی تعلیم کی طرف دوڑتے چلے گئے ہیں، اور یہ سمجھتے رہے ہیں کہ بس اس کے بعد ہم کامیابی کی منزل کو پہنچ گئے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کالج کی گراں قیمت تعلیم میں ہم اپنے بچوں پر جس قدر صرف کرتے ہیں اکثر ایسا ہو رہا ہے کہ ان لڑکوں کو اس تعلیم کے بعد اتنی رقم بھی ماہوار ملنی مشکل ہے، ہمارے لڑکے بی اے تک ایک بنی ہوئی شاہراہ پر پوری امنگ اور ولولوں کے ساتھ دوڑتے چلے جاتے ہیں اور ان کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سڑک کے خاتمہ پر ان کو اپنی منزل کا پتہ مل جائے گا، مگر وہ جب وہاں پہنچتے ہیں تو دفعتہً منزلِ مقصود کی رفیع عمارت کے بجائے ایک عمیق غار ان کو نظر آتا ہے اور وہ ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اب سوچتے ہیں،

گذری جو گذرنی تھی اب چاہئے کیا کرنا

غور کرتے ہیں تو سرکاری نوکری کے سوا اپنے اندر اور کسی کام کی صلاحیت نہیں پاتے اس سے مایوس ہو کر بعض لوگ تو ذرا کترا کر پھر آگے دوڑنا شروع کر دیتے ہیں، یعنی ایم اے کی تیاری میں لگ جاتے ہیں، اور بعض قانون یاد کرتے ہیں یا ٹریننگ کی فکر کرتے ہیں، لیکن اب ٹریننگ کا دروازہ بھی بند ہو رہا ہے، اور قانون کے میدان میں جو بھیڑ بھاڑ ہے اس سے کون بے خبر ہے،

ان واقعات نے یہ غور کرنے کا موقع دیا ہے کہ جن کو علم علم کے لئے حاصل کرنا ہے، آیا ان کیلئے اس طریقۂ تعلیم میں علوم کی تحصیل کا سامان ہے اور جن کو علم کمائی کے لئے حاصل کرنا ہے، کیا انھوں نے اس موجودہ طریقۂ تعلیم میں اپنی شکم سیری کا بھی کوئی فن سیکھا ہے؟

اب اس مسئلے میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہیں کہ ان چند لوگوں کے سوا جو علم کی واقعی تحصیل چاہتے ہیں، یا علمی اور تعلیمی پیشے میں زندگی گذارنا چاہتے ہیں، بقیہ افراد کو صرف اسکول کی تعلیم پر قناعت کرنا چاہئے اور اعلیٰ تعلیم کا فریب نہ کھانا چاہئے، اس تعلیم کے بعد ان کو کسی صنعت، حرفت، تجارت یا دوسرے ذرائعِ معاش کی طرف توجہ کرنی چاہئے، اعلیٰ تعلیم میں صرف ان ہی کو جانا چاہئے جو واقعی علم کے شیدا ہوں اور تحقیق و تکمیل کے طالب ہوں، اس میں شک نہیں کہ موجودہ حکومت نے اس اعلیٰ تعلیم کو اپنے چند بلند عہدوں کے لئے انتخاب کا معیار مقرر کر لیا ہے اور ان ہی کا لالچ قوم کی قوم کو اس کی طرف کھینچ رہا ہے، مگر غور کے قابل بات یہ ہے کہ یہ چند عہدے جو ہر صوبے میں دس بیس سے زیادہ نہیں، وہ ہزاروں اور لاکھوں مسلمانوں کو نہیں مل سکتے، جب چند سال کی دفتر گردی کے بعد بالآخر وہیں لوٹ کر آنا ہے تو پہلے ہی سے وہیں جانے کی تیاری کیوں نہ کیجائے؟

ہمارے ہاں تعلیم کی ایسی بندھی ہوئی اور محدود صورت اب تک ہے کہ خواہ لڑکے میں مناسبت ہو یا نہ ہو اور ان علوم سے ان کو وابستگی ہو یا نہ ہو، بہرحال وہ ان کو پڑھنا ہے اور ان میں ان کو کامیاب ہونا ہے، ورنہ آیندہ وہ کسی لائن میں بھی گھس نہیں سکتے، اس مجبورانہ طریقِ تعلیم نے ہمارے طلبہ کی ذہانتوں کا اور والدین کے سرمایہ کا بے دریغ خون کیا ہے، آخر قوم کی یہ ذہنی خودکشی اور مالی فضول خرچی کب تک جاری رہے گی اور کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ اس موجودہ تعلیمی نظام کے خلاف ہم اپنے لئے آپ ایک منظم تعلیم کی بنیاد ڈال کر عملاً بغاوت کا اظہار کریں، اور ان علوم کو چھوڑ دیں جن کا انتہائی مقصد عمدہ انگریزی سیکھنا ہو، اور ان علوم کو اختیار کریں جن سے قومی تربیت کے بعد حصول زر کا طریقہ سیکھا جائے،

ہم نے اس تعلیم کے متعلق کچھ نہیں کہا ہے جس کا مقصد علم کا حصول ہے کہ اس کے لئے سب سے پہلی شرط پیٹ کے سوال سے آزادی ہے، ہم نے اب تک یہ چاہا ہے کہ علم اور پیٹ دونوں مقصدوں

کو ایک تعلیم کے اندر جمع کردیں اور یہ ناممکن ہے، پیٹ کی تعلیم سے علم کی آسودگی حاصل نہیں ہوسکتی یہی سبب ہے کہ ہم نے مسلمانوں میں اس نئی تعلیم کے ذریعہ سے کوئی بڑا مصنف، کوئی بڑا محقق، کوئی بڑا فلاسفر، کوئی بڑا مورخ، کوئی بڑا سائنٹسٹ کوئی بڑا موجد، کوئی بڑا کیمسٹ، کوئی بڑا اسٹرانومر، کوئی بڑا میتھمیٹیشین پیدا نہیں کیا، اور اگر اتفاقاً پیدا ہو بھی گیا تو اس نے علمی زندگی نہیں پائی، کیونکہ علم کی صبرآزما اور سنگلاخ راہ سے کمال کی منزل تک پہنچنے کے بجائے جھوٹی پالیٹکس اور سرکاری نوکری کے ذریعے فخر و شہرت اور نام و نمود پیدا کرنے کا راستہ ان کو زیادہ آسان نظر آتا ہے، اور علم کا تقاضا ہے کہ علم کے سوا اس کے طالب کا کوئی اور مقصود نہ ہو،

تعلیم کی زبان

سب سے آخری بات تعلیم کی زبان کا مسئلہ ہے، میں نے ابھی مسلم یونیورسٹی کے خطبے میں اس پر اپنے مفصل خیالات ظاہر کئے ہیں جن کے دہرانے کی حاجت یہاں نہیں، اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس بدیسی زبان کی گرفت سے جو ۱۸۳۵ء میں ہم پر مسلط کی گئی، آزادی حاصل کریں، یہ نکتہ بھلایا نہ جائے کہ ہم نے بدیسی زبان کے ذریعۂ تعلیم ہونے کی مخالفت کی ہے، نئے علوم اور کسی قوم کی علمی و ادبی زبان سیکھنے کی نہیں، علوم و فنون خواہ کتنے ہی نئے ہوں اور کسی قوم سے ان کو نسبت ہو، وہ کسی خاص زبان کے اندر محدود نہیں، مسلمانوں نے ہندوستان، ایران اور یونان کے سب علوم و فنون سیکھے مگر اس طرح نہیں کہ انھوں نے اپنی تعلیم کی زبان ہندی یا ایرانی یا یونانی کر دی ہو، بلکہ یہ کیا کہ ان تمام زبانوں کے علوم و فنون کو خود اپنی زبان میں منتقل کیا یا دوسروں سے منتقل کرایا، اور اس اپنی زبان کے ذریعہ لوگوں کو ان علوم و فنون کی تعلیم دی، آج اگر یورپ ہی کی تقلید کمال کی دلیل ہے تو کیا کسی پست سے پست یورپین قوم کی مثال دی جاسکتی ہے، جس نے اپنی زبان کو چھوڑ کر دوسری اعلیٰ قوموں کی زبانوں کو علوم و فنون کی عام تعلیم کا ذریعہ قرار دیا ہو، کل بیت الحکمۃ نے بغداد میں جو کچھ کیا وہ کیا ہے، جو دار الترجمہ عثمانیہ میں آج نہیں ہوسکتا، جاپان نے انگریزی اور فرنچ کے ذریعہ اپنے ہاں

تعلیم نہیں پھیلائی، اور نہ آج ترکی تک با ایں ہمہ جدت پسندی جرمن اور فرنچ کو تعلیم کا ذریعہ بنا رہے ہیں، کیونکہ وہ اس نکتے کو سمجھتے ہیں کہ زبان کو قومیت کی تخلیق میں کیا اہمیت حاصل ہے،

۱۹۲۰ء میں فرانس جب شام کو امیر فیصل سے چھین کر اس پر قبضہ کر رہا تھا تو اس وقت اتفاق سے میں فرانس کے شہر ویشی میں تھا، فرنچ اخبارات شام پر اپنے قبضے کے جو وجوہ بتا رہے تھے ان میں سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ "یہ وہ ملک ہے جہاں فرنچ زبان کے تین سو اسکول ہیں" یہی وہ اسکول ہیں جہاں شامی بچوں کے دلوں میں فرانس کی محبت کا بیج بویا گیا، یہ بیج بڑھا اور آج ایک تناور فرنچ حکومت کے سایہ دار درخت کی صورت میں شام میں موجود ہے،

جامعہ کی چار دیواری میں اس اہمیت پر استدلال قائم کرنے کی ضرورت نہیں جو قوموں کی تکوین و تخلیق میں زبانوں کو حاصل ہے، مذہب کے بعد وہ زبان ہی ہے جو پوری قوم کو ایک متحدہ قوم بناتی ہے، وہ زبان جو کسی قوم میں ذریعۂ تعلیم نہ ہو کبھی سرسبز نہیں ہوسکتی یہی سبب ہے کہ جہاں تک نئے تعلیم یافتہ افراد کا تعلق ہے ہماری زبان کو بہت کم امداد ملی ہے، وہ تعلیمی زبان نہ ہونے کی وجہ سے علوم و فنون کے خزانوں سے محروم ہے، اور نئے علوم بدیسی زبان کے ایک ایسے پنجرے میں بند ہیں جہاں تک رسائی بے اس کے ممکن نہیں کہ پہلے ہم اس بدیسی زبان میں سالہا سال تک مہارت حاصل کریں پھر بھی ہمارے بچے ان علوم کی تہ تک بآسانی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک ان علوم کے سمجھنے سے پہلے وہ اس زبان کی مشکل کو حل کریں، مثال یہ ہے کہ آپ ان کو الجبرا یا حساب کا کوئی مسئلہ حل کرنے کو انگریزی زبان میں سوال دیتے ہیں، بچے کو پہلی مشکل یہ ہے کہ وہ اس سوال کی زبان کو سمجھے، پھر علم کی مشکل کو حل کرے، پھر بھی وہ اس کو اس آسانی سے نہیں سمجھ سکتا جس آسانی سے وہ اپنی مادری زبان میں سمجھ سکتا ہے اور سمجھ لینے کے بعد بھی اس کو مادری زبان میں دہرانے پر تو یقیناً قدرت نہیں رکھتا کہ اس کے لئے اس کو پہلے مناسب الفاظ اور مصطلحات کے پیدا کرنے کی مشکل درپیش رہتی ہے،

ہندوستان میں مسلمان نہ صرف یہ کہ مادری زبان میں علم کی تحصیل سے معذور ہیں بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ وہ سرے سے مادری زبان سے محروم ہیں، ہندوستان زبانوں کا دنگل ہے، صوبہ دار زبانوں کو چھوڑ کر اردو ہندی کا ایک مستقل دنگل اس ملک میں قائم ہے، ہمارے وطنی بھائیوں نے اس اہمیت کو پوری طرح محسوس کرکے جو زبان کو قوم کے وجود میں حاصل ہے، یہ عزم کرلیا ہے کہ وہ ہندی کو اپنی مادری نہ سہی تو علمی وادبی زبان تو ضرور ہی بنالین گے، لیکن مسلمان ابتک اس عزم اور فیصلے سے غافل ہیں اور ابھی تک انگریزی ہی بولنے لکھنے اور پڑھنے کو کمال کا معیار جان رہے ہیں، اور دوسری قوم سے مانگی ہوئی دولت پر فخر کرنا حماقت نہیں سمجھ رہے ہیں، اگر ہندوستان کو ایک قوم بننا ہے تو یہاں کی زبان کو بھی ایک ہندوستانی زبان بننا ہے اور یہ وہی زبان ہوگی جس کو ہندو مسلمانوں کی ملی جلی طاقت نے ایک ہزار برس کے میل جول سے اس ملک میں پیدا کیا ہے،

اب تک ہم اس ساحرانہ فریبِ نظر میں پھنسے تھے کہ ان نئے علوم کی تعلیم بدیسی زبان کے سوا ہندوستان کی مادری زبان میں ہو ہی نہیں سکتی، مگر یہ جادو اب ٹوٹ رہا ہے اور سرکار نظام کی بہادرانہ پیش قدمی نے اس جال کے ایک ایک تار و پود کو الگ الگ کردیا ہے، اور ثابت کردیا ہے کہ یہ علوم کسی خاص زبان کے پابند نہیں، شراب کو جس پیالے میں بھی پیو وہ شراب ہے اور تلوار کو جس غلاف میں بھی رکھو وہ تلوار ہے، سوال ظرف کا نہیں مظروف کا ہے،

مسلمانو! اٹھو اور ایک نئے تعلیمی نظام کی بنیاد رکھو، دنیا کا انتظار نہ کرو، وقت ہے کہ تم آگے بڑھو، دنیا خود تمھارے پیچھے آئے گی،

سید سلیمان ندوی،

۱۱ر اپریل ۱۹۳۳ء

آخری شاہانِ تیموریہ کا علمی ذوق

از

ازجناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب رفیق دارالمصنفین

بہادر شاہ ظفر

(۴)

سادہ بیانی ظفر نے جس طرح خیالات کو آسان اور سادہ بنانے کی کوشش کی ہے، اسی طرح اپنی شاعری میں زبان بھی نہایت ہی آسان اختیار کی ہے، اس کا پورا دیوان پڑھ جاؤ مشکل سے کوئی غزل ایسی نظر آئے گی جس میں فارسی کی مغلق ترکیبیں اور غیر مانوس لفظ استعمال کئے ہونگے، اسی لئے بعض ہمعصر شعراء کی طرح اس کی غزلوں میں بہت کم بیان اور معنی کا الجھاؤ پیدا ہونے پایا ہے، بعض غزلیں تو سلاست اور روانی کا نمونہ ہیں، کچھ ایسی ہیں کہ اگر ان کو نثر بنانا چاہیں، تو لفظوں کو آگے پیچھے کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی، مثالیں ملاحظہ ہوں،

ان کے دل میں غبار ہے دیکھیں — کس طرح سے صفائی ہوتی ہے،
عاشق! زیر تیغ سر دھر دو — ابھی مشکل کشائی ہوتی ہے،

آشنا ہو تو آشنا سمجھے، — ہو جو ناآشنا تو کیا سمجھے،
ہم اسی کو بھلا سمجھتے ہیں، — آپ کو جو کوئی برا سمجھے،
تو ہی کعبہ میں تو ہی بتکدہ میں — ہے وہ مشرک جو دوسرا سمجھے،

اے ظفر وہ کبھی نہ ہو گمراہ   جو محبت کو رہنما سمجھے،

میں ہوں عاصی کہ پر خطا کچھ ہوں،   تیرا بندہ ہوں اے خدا کچھ ہوں

جز و کل کو نہیں سمجھتا میں   دل میں تھوڑا سا جانتا کچھ ہوں

منہا ہم کہیں تو کیا کہویں   سُجدا ہم کہیں تو کیا کہویں،

مدعی کہنے ہی نہیں دیتے   مدعا ہم کہیں تو کیا کہویں،

مثل فوارہ سر بلند نہ کر   کہ بلندی کے ساتھ پستی ہے،

رنج و غم کو خدا رکھے آباد   خانہ دل میں ایسی بستی ہے،

وہ بت جمال اور ہی ہے   اسمیں دیکھا کمال اور ہی ہے،

ترا ابرو کہاں ہلال کہاں   یہ جبیں پر ہلال اور ہی ہے،

سہل ممتنع کی مثال ملاحظہ ہو،

دردِ دل اپنا صنم،   کیوں نہ ہم تجھ سے کہیں

چپ رہا جاتا نہیں   کب تلک چپکے رہیں

پھر رہا ہے دل مرا   کیوں نہ پھر آنسو بہیں

چشم و دل دونوں بر ہے   ہم بھلا کس کو کہیں

یہ ترے جور و ستم   یار ہم کب تک سہیں

اس غزل پر سب ظفر   آفرین تجھ کو کہیں

ظفر کی شاعری کا بڑا حصہ اسی سادگی کا مکمل نمونہ ہے، ہر جگہ طرز بیان صاف، سادہ اور سہل ہے بھاری اور گران لفظ بہت ہی کم ہیں، ظفر نے اس قسم کا طرز جانکر اختیار کیا، خود کہہ گیا ہے،

اے ظفر چاہیئے ہاں لطف سخن میں ایسا   کہ جسے سن کے ہوں سب عالم و جاہل محظوظ

چنانچہ بعض اوقات یہ سادگی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کی شاعری روزمرہ کی گفتگو معلوم ہونے لگتی ہے، مثلاً

مر گیا بیمار اس کے نرگس بیمار کا   دوستو اچھا ہوا اچھا ہوا اچھا ہوا

خیر تو ہے کیا ہوا، بگڑی کہیں اس یار سے   آج کیوں تو اے ظفر پھرتا ہے گھبرایا ہوا

ساتھ میرے چلے چلو چپ چپ   راہ میں تم نہ کچھ کہو چپ چپ

گھر میں چل کر شکایتیں کرنا   یاں نہ مجھ سے گلہ کرو چپ چپ

میرے جاتے ہی انکے غیروں سے   پھر لگی ہونے گفتگو چپ چپ

ابھی صیاد کی لگی ہے آنکھ   نہ کرو شور بلبلو چپ چپ

دل کسی غنچہ لب کو تم نے دیا   اے ظفر تم جو رہتے ہو چپ چپ

جس کو سناؤں درد دل آئے نہ اسکو تاب   سنتے ہی یہ کہے کہ بس اے دردمند بس

اتنی زباں دراز نہ ہو یاں بھی ہے زبان   بس اب آگے کیجئے زبان اپنی بند بس

میری نگاہ ہے وہ غضب دیکھکر جسے   خنجر تو الحفیظ کہے الاماں تیغ

ہوں وہ مثل زلف برہم اور میں   ان کی زلفوں کی بلائیں لوں چیں خوش

آؤ گھر میرے اے صنم آؤ   تمہیں اللہ کی قسم آؤ،

قاصدو لاؤ جلد خط کا جواب   ایک دم جاؤ ایک دم آؤ،

اے بتو میرے خانۂ دل کو   دیر تم سمجھو یا حرم آؤ،

میری گریہ سے ہے اگر منظور   سیر آب رواں ادھر آؤ

اتنی تاثیر ہے کہاں کہ جو تم   سن کے میری فغاں ادھر آؤ

آگئی میری جان ہونٹوں پر — اب تو اے میری جاں ادھر آؤ

جاؤ تنہا نہ تم تمہارے ساتھ — جائیگی میری جاں کھڑے تو رہو

ہے پڑی دل جلوں کی آہ جہاں — تاب کیا تم وہاں کھڑے تو رہو

قد پہ نازاں ہے اپنے سرو چمن — اک ذرا تم بھی ہاں کھڑے تو رہو

شکایت کس سے کی ہیں بلا لو سامنے ہمکو — کرونگا شکوہ میں تیرا معاذ اللہ معاذ اللہ

قد جاناں کو دو تشبیہ کیونکر نخل طوبیٰ کر — کہاں وہ قد کہاں طوبیٰ معاذ اللہ معاذ اللہ

جو کہ عاشق کو جلائے جوں شمع — وہ بھی جلتا رہے، آمین اَللہ

اپنے مرنے کی دعا گر مانگوں — وہ ستمگر کہے، آمین اَللہ،

جو ستائیں تجھے ان کو بھی ظفر — عوض اس کا ملے آمین اَللہ

محبت کے یہ معنی ہیں کہ میں نے — وہی چاہا کہ جو کچھ تو نے چاہا،

فقیروں سے تو پوچھو لذتِ عشق — اہاہاہا اہاہاہا اہاہاہا اہاہا،

اس بے تکلف طرزِ بیان اور اندازِ گفتگو کو سن کر اگر اہلِ سخن ظفر ہی کی زبان سے کہیں کہ ان ع

اشعار کے تصدق اس گفتگو کے صدقے

تو شاید حق بجانب ہونگے،

محاورات اس سادگی کے باوجود ظفر کو زبان پر اتنی قدرت ہی کہ بادشاہِ سخن بن کر زبان اور الفاظ پر فرمانروائی کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قلعۂ معلیٰ بلکہ اردو زبان کا کوئی محاورہ ایسا نہیں جو اس کے دیوان میں موجود نہ ہو، اور ان محاوروں کو اس خوبی اور صفائی سے اپنے اشعار میں باندھ جاتا ہے، کہ اشعار کی روانی میں کہیں فرق نہیں آنے پاتا، مثلاً چرانا ہے، اب اس مصدر سے جو ممکن اور مروج محاورے تھے، ان سب کو ظفر نے اپنی ایک غزل میں استعمال کیا ہے،

ملاحظہ ہو:-

محبت کی کوئی اب آنکھ تجھ سے ہم چراتے ہیں — علم ہوں گرچہ سو شمشیر کین کب ہم چراتے ہیں

نہیں شمشیر سے جنگی جھپکتی آنکھ میداں میں — نظر وہ دیکھ تیرا ابروئے پُر خم چراتے ہیں

نہ رو کون کب تلک اشکو نکو اور رو کون تو ڈر یہ ہے — کہ پانی زخمِ دل اے دیدۂ پُر نم چراتے ہیں

یہ طفلِ اشک ہیں وہ چور باندھی چور مژگاں نے — کہ آنکھوں میں سے کاجل دیکھ تو بیہم چراتے ہیں

ظفر سر عشق کمسر باز دیتے ہیں محبت میں،

وگرنہ جان اپنی یاں بڑے رستم چراتے ہیں،

یا مثلاً توڑنا ہے، دم توڑنا، قسم توڑنا، ستم توڑنا، قدم توڑنا، توبہ توڑنا، نشترِ غم توڑنا، نفس سرکش کو توڑنا، اتنے محاورے کو ظفر نے جسطرح استعمال کیا ہے، ان کو بھی دیکھئے،

زیرِ خنجر ترے بسمل جو یہ دم توڑتے ہیں — کوچۂ غم میں پھر آنے کی قسم توڑتے ہیں،

دل مرا لے کے جو وہ سنگ ستم توڑتے ہیں — کیا ستم کرتے ہیں کیوں ساغرِ جم توڑتے ہیں؛

ہر قدم پر ترے دیوانے سرِ دشتِ جنون — سیکڑوں خار سدا زیرِ قدم توڑتے ہیں؛

ابرِ مژگان سے بندھی رہتی ہے اشکوں کی جھڑی — تار رونے کا نہیں دیدۂ نم توڑتے ہیں؛

جامِ مُل دیتے ہیں تو کر نہ تامل ساقی؛ — توبہ ہم آج ترے سر کی قسم توڑتے ہیں؛

ہیں ہمیں سبحہ و زنار برابر دونوں — نہ ہم یہ جوڑتے ہیں اور نہ یہ ہم توڑتے ہیں؛

آتے ہیں پھر سرِ کاوش جو کبھی حضرتِ عشق — سیکڑوں دل میں مرے نشترِ غم توڑتے ہیں؛

نفسِ سرکش کو ظفر توڑتے ہیں جو اپنے،

میرے نزدیک بڑا ہی وہ صنم توڑتے ہیں؛

اسی طرح اڑجانا ہے خبر اڑجانا، رونق اڑجانا، نیند اڑجانا، رنگ اڑجانا، تاب اڑجانا،

تے اڑ جانا وغیرہ محاورے مستعمل ہوتے ہیں انکو بھی ظفر نے اپنے اشعار کی لڑیوں میں پرو دیا ہے،

جب چمن میں اس کے آنیکی خبر اڑ جائیگی — گل کی رونق دم میں لے باد سحر اڑ جائیگی

آپ کا کیا جائیگا گر خواب میں آؤ گے تم — نیند آنکھوں سے ہماری رات بھر اڑ جائیگی

خون کو مل لیگا میرے تو کف پا سے ترے — سرخی رنگ حنا لے فتنہ گر اڑ جائیگی

آئیگا وہ مہر وش لے دل تو شبنم کی طرح — تاب و طاقت تیری اسکو دیکھ کر اڑ جائیگی

یہ صبا سے کوئی پوچھے تیرے کیا آئیگا ہاتھ — خاک میری اسکے کوچے سے اگر اڑ جائیگی

شعلۂ رخسار ساقی گر ہوا پر تو فگن

مے جو ہے ساغر میں تیرے اے ظفر اڑ جائیگی

بلا ڈال دینا، مصیبت ڈال دینا، زنجیر ڈالدینا، شمشیر ڈالدینا، قلم ڈال دینا، دریا میں ڈال دینا، جدائی ڈال دینا، آگ ڈال دینا، تاثیر ڈال دینا جیسے محاورات پر ظفر کی طبع آزمائی سنئے

دل پر بلائے زلف گرہ گیر ڈال دی — تو نے مصیبت اے مری تقدیر ڈالدی

جب روبرو وہ آئے تو پائے نگاہ میں — موج سرشک چشم نے زنجیر ڈالدی

اپنی بھوین بنا کے دکھائیں جو یار نے — شمشیر گرتے ہاتھ سے شمشیر ڈالدی

لکھا جو ہم نے اپنی سرافگندگی کا حال — گردن قلم نے بھی دم تحریر ڈالدی

جب ہم سمجھ گئے کہ ہے تقدیر کیمیا — دریا میں ہم نے جیسی تھی اکسیر ڈالدی

چوں مہر و مہ بہم ہوئے دو بار گردوں — تو نے جدائی اے فلک پیر ڈالدی

کیا خاک دل مرا ہو خالی کہ اور بھی — تو نے نہ آگ نالۂ شب گیر ڈالدی

مانی دکھا کے اپنا مرقع خجل ہوا — جب اس کے سامنے تری تصویر ڈالدی

کیونکر نہ ہو اثر دل عالم میں اے ظفر — تیرے سخن میں عشق نے تاثیر ڈالدی

کھینچنا کے مختلف محاورات بھی سن لیجئے،

جو خنجر گل نے عندلیب زار پر کھینچا — تو قمری کو بھی ہے سرو چمن نے دار پر کھینچا

کھڑا ہوں محو حیرت یوں لگا دیوار سے تیرے — کسی نے نقش ہو جیسے کوئی دیوار پر کھینچا

وفا کا کرکے تو اقرار ہم سے ہو گیا منکر — تری الفت سے ہم نے ہاتھ اس انکار پر کھینچا

جلا دیگا جہان کو دیکھ لینا یہ دل سوزاں — جو نالہ اس نے اور اک آہ آتشبار پر کھینچا

خط رخسار کو تیرے جو دیکھا اے گلستاں رو — قلم سب خوشنویسوں نے خط گلزار پر کھینچا

ہوئی کچھ تو دل بسمل کی اپنی صورت تسکیں — تری تصویر کو جب سینۂ افگار پر کھینچا

دل زخمی سے اپنے ناوک دل دوز کو اسکے

اگرچہ کھینچنا تھا اے ظفر دشوار پر کھینچا

ظفر کے دیوان میں محاورہ بندی کی سیکڑوں مثالیں ملیں گی، ہم نے طوالت سے بچنے کے لئے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا ہے، لیکن انہی سے اندازہ ہوا ہوگا، کہ ظفر کو زبان پر کتنی قدرت ہے، یہ ہے، کہ وہ اپنے کو الفاظ کا تابع نہیں بناتا ہے، بلکہ الفاظ کو اپنا تابع بناتا ہے، اسی لئے وہ الفاظ کے ساتھ کھیلتا ہے، اور اسی تفریح اور کھیل میں زبان اور بیان میں ایک خاص لطف اور چاشنی پیدا کر دیتا ہے،

صنائع لفظی اس کا کلام لفظی صناعی سے جو متاخرین کے کلام کا زیور ہے خالی نہیں، پہلے مصرع کے لفظوں کو الٹ پلٹ کر دیکھئے کیسے دوسرا مصرع بنا لیتا ہے،

یہی ایک غم ہے، یہی اک الم ہے — یہی اک الم ہے یہی ایک غم ہے

مری چشم نم ہے، اسی رنج و غم میں — اسی رنج و غم میں مری چشم نم ہے

خدا کی قسم ہے، یہ کہتا ہوں سچ میں — یہ کہتا ہوں سچ میں خدا کی قسم ہے

کیا کب رقم ہے کوئی شکوہ مین نے — کوئی شکوہ مین نے کیا کب رقم ہے

ظفر کیا ستم ہے ہوا دوست دشمن، — ہوا دوست دشمن ظفر کیا ستم ہے

آیا سحاب ساقی تو لا شراب ساقی — تو لا شراب ساقی آیا سحاب ساقی

ہے پیچ و تاب ساقی زلفوں سے تیری دل کو — زلفوں سے تیرے دل کو ہے پیچ و تاب ساقی

کیا مست خواب ساقی آنکھیں ہیں آج تیری — آنکھیں ہیں آج تیری کیا مست خواب ساقی

مے آفتاب ساقی ہے ہم خنک دلون کو — ہے ہم خنک دلوں کو مے آفتاب ساقی

مت کر خراب ساقی تو بزم میکشاں کو — تو بزم میکشاں کو مت کر خراب ساقی

جام حباب ساقی دریا میں کس نے الٹا — دریا میں کس نے الٹا جام حباب ساقی

ہے یہ عذاب ساقی تو ہے ظفر سے بدتر

تو ہے ظفر سے بدتر ہے یہ عذاب ساقی

بدیع کی اصطلاح میں اس کو "عکس" کہتے ہیں، یہ صفت اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں میری نظر سے نہیں گذری، البتہ قدیم فارسی شعراء کے یہاں یہ ملتی ہے، اس کے علاوہ دوسری لفظی صنعتیں بھی ظفر کی شاعری میں پائی جاتی ہیں، مثلاً

۱- تنسیق الصفات یعنی کسی موصوف کی پے درپے صفتوں کا لانا، جیسے

شوخ چشمے خوش نگاہے بیوفائے بدگمانے — دل فریبے دلنوازے دلربائے دلستانے

مست نازے فتنہ سازے تندخوئے جنگجوئے — ظلم کیشے ظلم کوشے ظلم خواہے ظلم رانے

کج کلاہے کج ادائے پرفریبے پردغائے — بدطریقے بدشعارے بدمزاجے بدزبانے

خوش نگاہے خوبروئے بذلہ سنجے نغزگوئے — ہوشیارے حرف گیرے نکتہ طبعے نکتہ دانے

خود پرستے خودنمائے خودپسندے خودستائے — خودسرے ناآشنائے سرکشے نامہربانے

ہم ظفر ہیں اس پہ مفتوں خوار و رسوا از جنوں — وہ یہ مانے یا نہ مانے وہ یہ جانے یا نہ جانے

۲- لزوم مالا یلزم یعنی قافیہ کے آخری حرف (روی) کے پہلے کسی خاص حرف کا التزام کرلینا جیسے

توبہ اے ساقی نہیں پینے کا میں جام شراب — مجھ کو اپنی بادۂ وحدت کی مستی خوب ہے

جس طرح مژگان سے میرے ہیں بندھے اشکوں کے تار — اس طرح بدلی نہیں کوئی برستی خوب ہے

خواب میں جلوہ دکھا دیتا ہے وہ مہوش کبھی — چشم میری دیکھنے کو جب ترستی خوب ہے

راہ بہتر ہے رہ ہموار رہرو کے لئے — نہ بلندی ہے بہت اچھی نہ پستی خوب ہے

خود پرستی چھوڑ دو، یہ بت پرستی ہے صریح

غافلو حق میں تمہارے حق پرستی خوب ہے

۳- سیاق الاعداد یعنی کلام میں اعداد کا لانا جیسے

چلنا مریض غم کو ترے آٹھ نو قدم — معلوم ہوے ضعف سے دس بیس قدم

پہلے تھا ایک ستم پھر ہوے ایک کے دو — دو کے پھر چار ہوے ہو گئے اب چار کے چھ

چار بار آٹھ پہر میں ہیں وہ ان سے ملتے — ان سے ملنے کی ہیں معلوم جنھیں گھاتیں چار

ناخن کریں ہیں زخموں کو دو دو ملا کے ایک — تھے آٹھ دس سو ہو گئے اب چھل کے چار پانچ

پھپھولے دل پہ جو دس بیس داغ ہیں دو تین — تو قمقمے ہیں بہت اور چراغ ہیں دو تین

۴- تلمیع یعنی کلام میں ایک حصہ دوسری زبان کا لانا جیسے

جلوۂ شبنم و گل پر ہے رولاتی ہے مجکو — دم گلگشت چمن یاد رُخ پرعرقے

کچھ عوض دل کے وہ تکرار سے دیتا ہے تو کیا — الے برالے یا قلقے برقلقے

رُخ گلگوں پہ ہے اس گل کے نہ شک کی سرخی — جلوۂ صبح بہاران و بہار شفقے

اے ظفر تم کو ہے منظور اگر رد حسود — تو پڑھا کیجیے قل اعوذ برب الفلقے"

۵- حسن التکریر، اس کی مثالیں تو ظفر کے یہان کثرت سے ہین، ہم صرف چند اشعار پیش کرین گے،

مجھ مین اور گل اس میں باہم گفتگو تھی صاف صاف بات کی لغزش نہ تھی واللہ جو تھی صاف صاف

نکہت گل لے گئی دل کو ہمارے باغ میں تیری ہی سی لے سراپا ناز و بو تھی صاف صاف

شمع کی طرح سے ہم رات کو روتے روتے بہ گئے آنسوؤں میں صبح کے ہوتے ہوتے

موت یار آئی تو غفلت سے ہوئے یون ہم ہشیار ڈر کے جوں خواب میں چونکے کوئی سوتے سوتے

آگاہ تو کیا مجھے لذت سے عشق کی زخموں نے اس نے میرے نمک گر بھر ابھرا

کیا بھر دیے ہیں کان خدا جانے غیر نے غصے میں جو بھرے ہے وہ کافر بھرا بھرا

گہ یاس و گہہ امید و گہے رنج و گہہ خوشی مہماں سرائے دل میں ہیں مہمان عجب عجب

اے چشم یار بار نہ ہو دیکھ اشک بار ہر بار تجھ سے اٹھتے ہیں طوفان عجب عجب

گل جو چمن میں ہیں ہزار دیکھ ظفر ہی کیا بہار سب کا ہی رنگ جدا جدا سب کی ہی بو الگ الگ

تجھے دے ہے چمن چمن کے گلہائے تازہ مرا دیدۂ خوں چکان اچھے اچھے

گر آہ و نالہ دونوں پیدا ہوں ایک دل سے لیکن الگ الگ ہے تاثیر اپنی اپنی

خالی نہیں جہان میں تمنا سے کوئی دل ہر ایک میں ہے گرچہ تمنا جدا جدا

ایک ہی تشبیہ کو طرح طرح سے ادا کرنا

ظفر کے یہان ایک چیز اور ہے، جس سے اسکی قدرت ادا کا حال معلوم ہوتا ہے، زلف اور سانپ کی تشبیہ معمولی چیز ہے، مگر دیکھئے کہ ظفر نے اسی ایک تشبیہ کو ذرا ذرا رنگ بدل کر کس کس طرح ادا کیا ہے،

نہیں اس رُخ پہ زلف، وہ زیر زلف اس زلف کا شانہ چمن میں ناگ سا لڑتا ہوا ناگن سے نکلا ہے،

دیکھ کر آئینے میں وہ زلف کو ہنسنے لگے، بند پانی میں پڑا طرفہ کہین کا سانپ ہے

چاند پر دوڑتا ہے مار سیاہ شب تار رُخ روشن پہ ترے زلف کو بل کھاتے ہے

زلف یوں روئے عرق آلودہ پر لہرا ئے ہے صبح جوں ناگن گلوں پر چاٹنے اوس آئے ہے

زلف یوں چہرے پہ ہلتی ہے ہوا سے اسکے جس طرح مار سیہ کھائے ہے بل پاؤں کے بل

جس طرح مار سیہ گل سے لپٹ جاتا ہے زلف یوں تیری گئی ہے گل رخسار سے مل

جوں شانہ اسکو اے دل صد چاک تو نہ چھیڑ مار سیہ سے کم نہیں ہرگز گزند زلف

ناگنی زلف بتاں کی یہ عجب کافر ہے کاٹ کے بیٹھی ہے یان ہو کے دوتا اور طرف

کیا تماشا ہے تری زلف کا عکس آئینہ میں سانپ کی طرح سے لہرائے ہے تالاب میں موج

نچوڑے زلف نہا کر جو وہ تو قطرۂ آب وہاں پہ مار سیہ کا لعاب ہو خالص

حلقہ ہے بلا زلف کا اے پنجہ شانہ دیکھو کہیں انگلی نہ سیہ مار کے منہ مین

اڑ کر بھی زلف یار سے ناگن نہ بچ سکی جس وقت اس کے منہ پہ چڑھی مار کھا گئی

سوچا جی میں ہوں اس زلف دو گوش کو دیکھ سانپ کو پکڑوں کہ میں سانپ کے من کو پکڑوں

نہیں اس یار کے روئے عرق آلودہ پہ زلف اسکو چاٹتا ہے سانپ یہ پیاسا کالا

کیوں سوتے سوتے چونک پڑے خواب میں ظفر وہ مار زلف دیکھ کے شاید ڈرے سے ہو

دکھاوے کان کے بالے میں اسکو زلف الجھا کر نہ دیکھا جس نے ہو مار سیہ کو لڑتے بچھو کو

کہتا ہوں دل کو زلف کی ناگن سے کر حذر جاتی پلٹ ہے دیکھ یہ بدذات کاٹ کے

زلف آگئی صبا سے وہ خال دہن کے پاس مار سیاہ کھیلے ہے کیا اپنے من کے پاس

ناگن سی باغ میں کوئی لہرا رہی ہے یہ یا زلف تیرے چہرہ پہ کھائے ہے بل پڑی

ہوا سے یوں جو تیری زلف عنبریں الٹی کسی کو ڈس سکے یہ ناگن نہ ہو کہیں الٹی

یار کی زلف کو سنبل سے تشبیہ دینا عام بات ہے، مگر سنئے کہ اسی عام چیز میں ظفر اپنی جدت طبع سے کیسی کیسی ندرتیں پیدا کرتا ہے،

مجھے آئے نہ رونا دیکھ کر کیوں سنبلِ تر کو
کہ پھر جائے ہے اسکی زلف دل اور پر آنکھوں میں

سنبل کی لہر سے نہ رہے پھر ہمیں مطلب
یکدست جو تم کاکلِ خم دار دکھا دو

سنبل ہی کیا پریشان ہو دیکھ زلف تیری
موجِ نسیم کو بھی ہے پیچ و تاب ساقی

تا حشر نہ ہو خواہشِ نظارۂ سنبل
تم ہم کو اگر زلفِ گرہ گیر دکھا دو

مرے مزار پہ روئیدہ کیوں نہ ہو سنبل
کہ تیری زلف سے ہی دل کو پیچ و تاب ہنوز

تری زلف کے سامنے تاب کیا
کہ بل باغ میں شاخِ سنبل کرے

سنبل چمن میں کیونکہ نہ ہو غرق آبِ شرم
منہ دھو کے وہ بال سنوائے علی الصباح

اگر ہو عکس افگن یار کی کاکل سمندر میں
تو پیدا جائے موجِ آب ہو سنبل سمندر میں

انھیں ہو رشک سو اس زلف پُر شکن کی عجب
کہ شاخِ سنبلِ تر کھا کے پیچ و خم ٹوٹے

بیان کیونکر بھلا ہوئے حدیث اس زلف پیچاں کی
نہ جب تک چل کے کیجئے سیرِ بکیر سنبلستاں کی

زلف اسکی پُر شکن سے کیا بلا کرتی ہے بل
دیکھ کھا گئیں شکستیں شاخِ سنبل باغ میں

سنبل پیچاں اُگے کیونکر نہ اسکی خاک سے
مر گیا جو دیکھ کر اس زلفِ عنبر بو کے بل

ہے نہ قربان ہی رُخِ قاتل خونریز پہ گل
کھاتی سنبل بھی ہے اس دلآویز پہ گل

سنبل ہو گئی اوس سی پڑ جب کہ دمِ غسل
پانی تری اس زلفِ گرہ گیر سے ٹپکا

یار کے ابرو کو شمشیر سے تشبیہ ہر شاعر نے دی ہے، مگر دیکھئے کہ ظفر نے اس تلوار کے کیسے کیسے ہاتھ دکھائے ہیں،

جب ہو گئی وہ ابروئے خمدار سامنے
دی پھینک اپنے ہاتھ سے تلوار سامنے

کون ہمسر ہو سکے اس ابروے خمدار سے
دم نہ اتنا تیغ میں اِنے اسقدر خنجر میں ہے

کون منت کشِ شمشیرِ اجل ہو قاتل
طاق تیرا خمِ ابرو بھی ہے خونخواری میں

قتل کریں اک عالم کو وہ ابرو کے خم ایسے ہیں
ان شمشیروں کے ہیں مقابل دیکھو باہم ایسے ہیں

کس نے دیکھا خمِ ابرو کو ہے پیمانے میں
چل رہی آج جو تلوار ہے میخانے میں

نہیں شمشیر سے جن کی جھپکتی آنکھ میدان میں
نظر وہ دیکھ تیرا ابروے پُر خم چراتے ہیں

ہے طرفہ طلسم ابروؤں میں تیرے جو ٹیکے
اک قبضہ تلوار میں ہیں عربدہ گردو

کیا لائے اس ابرو کی بھلا تابِ دمِ تیغ
ہو جائے اسے دیکھتے ہی آب دمِ تیغ

جب جنبشِ ابرو سے تری قتل ہو عالم
پھر شرم سے ہو جائے نہ کیوں آب دمِ تیغ

جلا دو کھا اپنی تو شمشیر تو مجھ کو،
کشتہ ہوں میں ابرو کا جو ہے آب دمِ تیغ

تیغِ ابرو سے میں جانباز ظفر سینہ سپر
بے اجل پڑتا نہیں دھار سے تلوار کے خط

ابرو پہ اس کے چین کا عالم ظفر ہو اور
جوہر نہاں ہیں یہ کسی شمشیر میں غلط

ابرو کو اسکی کہتے ہیں سب تیغِ اصفہان
ہے اصفہانیوں میں کہاں ایسا خم ودغ

کہاں ہے دل میں گنجائش تری تیغِ دو ابرو کی
میان کب اک میان و بہم شمشیر ہوتی ہیں

جہاں کو جنبشِ ابرو سے اس نے قتل کیا
الٰہی اسکی یہ شمشیر ہل گئی تھی کیوں،

جیسی ہے چین اس ابروے پُر خم پہ خوشنما
جوہر کہیں بھی ایسے نہ شمشیر پہ کھلے

ابرو ہلی جو اس کی عجب سیر ہو گئی
تلوار چلتے چلتے رہی خیر ہو گئی،

معشوق کی مست آنکھوں کا نقشہ کس کس طرح کھینچا ہے،

یادِ چشمِ مست میں اسکی یہ کیفیت رہی
ہوش باطن میں رہا ظاہر مجھے غفلت رہی

ہم نہ کہتے تھے کہ نرگس کو دکھا مت چشمِ مست
نیند اسکی آنکھ سے ای مست خواب اڑ جائیگی

کر دیا اک نگاہ میں بے خود
چشم کافر ہے کیا خدا جانے

تری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
ہم بھی دانا تھے پر اب پھرتے ہیں دیوانے سے

ہم کو اس دور میں ہو کیوں طلب ساغرے | یہ توجب ہو کہ تری نرگس مخمور نہ ہو
سو فتنہ خوابیدہ بیدار ہوں اک پل میں | گر خواب میں بھی دیکھے اس نرگس فتاں کو
مجھے سوجھے ہے کیفیت جہان کی | وہ چشم مست ساقی جام جم ہی
مین مستی میں جو تو اپنی ذرا دکھلائے آنکھ | شرم سے نرگس کی گلشن میں نہ کیوں جھک جائے آنکھ
اشک آنکھوں میں اپنی کیوں نہ وہ بھر کر | ساغرے دیکھ کر جس کو تری یاد آئے آنکھ
اپنی چشم مست کی گردش نہ اے ساقی دکھا | دیکھ چکر میں ابھی جام شراب آجائے گا
بھرا ہوا ہے تری چشم مست میں یوں ناز | کہ جس طرح سے مئے ناب جوں ایاغ کے بیچ
اٹھا کے آنکھ نہ دیکھا چمن میں نرگس نے | رہا جو اس کو تری چشم پہ حیا کا لحاظ
کرے ہی فتنہ ترے چشم فتنہ زا کا لحاظ | یہ وہ بلا ہے، بلا کو ہے اس بلا کا لحاظ
کشتہ ہوں چشم مست کا میرے مزار پر | لازم ہے جام بادۂ انگور کا چراغ
روشن ہو چشم مست کے کشتہ کے گور پر | روغن کی جائے بادۂ انگور سے چراغ
کیفیت اپنی چشم سیہ مست کی نہ پوچھ | صوفی تمام دیکھ کے میخوار بن گئے،
منظور ہے ظفر کو لکھے وصف چشم یار | نرگس کے دے قلم کوئی اے ہم نشین تراش
چشم مست اس کی لے ہی جائے ہی ہوش | گرچہ ہم ہوشیار رہتے ہیں،
چشم اسکی خود ہے، سحر نگاہیں ہیں، | حاجت نہیں ہے سرمہ جادو کی آنکھ میں
کاسہ چشم تصور چھوڑ کر اپنا کبھی | اے ظفر محو تماشا ہیں نہ جام و جم میں ہوں
بغیر بادہ بھی اس شوخ خود پرست کی آنکھ | نشے میں حسن کے ایسی ہی جیسے مست کی آنکھ

(باقی)

تلخیص و تبصرہ

سیلنڈرا کی سلطنت

"کئی مہینے ہوئے بہار ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر آر۔ سی۔ موز مدار نے انگریزی میں اس عنوان پر ایک مقالہ پڑھا تھا، ذیل میں اسکی تلخیص ہے"

ڈچ محققون کی تحقیق سے ہندوستان کی ایک وسیع سلطنت کے وجود کا پتہ چلا ہے، جو ملایا کے پورے حصہ میں واقع تھی، جس شاہی خاندان نے اس سلطنت پر حکمرانی کی، اس کا ذکر ہندوستان کی کسی گذشتہ تاریخ یا کتاب میں نہیں ہے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہ شاہی خاندان نسبًا ہندوستانی تھا، اور اس نے اپنی حکومت کے زمانہ میں ہندوستان سے برابر تعلقات قائم رکھے،

یہ شاہی خاندان سلینڈرا کے نام سے موسوم تھا، ۷۵۰ء میں اس کا شاہی اقتدار ملایا میں قائم ہوا اور رفتہ رفتہ پورا ملایا جس میں سوماترا اور جاوا بھی شامل تھے، اس کے قبضہ میں آگیا، اس کا اثر انام اور کمبوڈیا میں بھی پھیلا، اس سلطنت کے تمول اور شوکت کے حالات عرب تاجرون نے لکھے ہین، جو یہان برابر آتے رہتے تھے، ابن خردازبہ (۸۴۴ء ۲۳۰ھ) نے لکھا ہے، کہ زابج کا بادشاہ مہاراجہ کہلاتا ہے، اسکی روزانہ آمدنی دو سو من سونا ہے، وہ سونے کی ایک اینٹ بناتا ہے، اور پانی میں یہ کہہ کر پھینک دیتا ہے، کہ یہیں میرا خزانہ ہے، اسکی آمدنی کا ایک حصہ قریب سو من سونا روزانہ مرغ کی لڑائی سے حاصل ہوتا ہے، جو مرغ جیتا ہے، اسکی ایک ٹانگ کا مالک بادشاہ ہوجاتا ہے، مرغ کا مالک سونا دیکر اس کو

محفوظ کرلیتا ہے، ابن روستہ (سنہ ۹۰۳ء) کا بیان ہے، کہ زابج کا بادشاہ مہاراجہ کہلاتا ہے یعنی بادشاہوں کا بادشاہ، مگر وہ ہندوستان کے بادشاہوں میں سب سے بڑا نہیں سمجھا جاتا ہے، کیونکہ وہ جزیرہ میں رہتا ہے، کوئی بادشاہ اس سے زیادہ دولتمند یا طاقتور نہیں ہے، اور کسی کی آمدنی اس سے زیادہ نہیں ہے،

ان کے علاوہ اور دوسرے عرب مصنفوں نے بھی مثلاً اسحٰق بن عمران (المتوفی سنہ ۹۰۰ء) اور ابن سرابیون نے بھی یہاں کے حالات لکھے ہیں، لیکن ان میں ابوزید حسن کا بیان بہت ہی مفصل ہے، جس نے سلیمان کے بیانات کے ساتھ کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا ہے، اس کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے، کہ زابج اور چین کی مسافت بحری راستہ سے ایک مہینہ کی ہے، اگر ہوا موافق ہو تو یہ مدت اور بھی کم ہوجاتی ہے یہاں کا بادشاہ مہاراجہ کے نام سے مشہور ہے، اسکی سلطنت کا رقبہ ۹۰۰ فرسنگ ہے، بادشاہ دوسرے دوسرے جزیروں کا بھی مالک ہے، جو ایک ہزار فرسنگ تک پھیلے ہوئے ہیں، جن جزیروں پر اسکی حکومت ہے، ان کے نام یہ ہیں، سری بزہ اور رامی جن کے رقبے ۴۰۰ اور ۸۰۰ فرسنگ علی الترتیب ہیں، کالاہ کا بحری ملک بھی جو چین اور عرب کے درمیان واقع ہے، مہاراجہ کے حدود میں داخل ہے کالاہ کا رقبہ ۸۰ فرسنگ ہے، یہ عود، کافور، صندل، عاج، آبنوس اور مسالے کا بہت بڑا تجارتی مرکز ہے، اس سے اور عمان کے بندرگاہ سے تجارتی لین دین برابر جاری رہتا ہے، جس جزیرہ میں مہاراجہ رہتا ہے، وہاں بہت ہی گنجان آبادی ہے، اور گاؤں کی ایک مسلسل قطار ہے، ایک گاؤں میں صبح کے وقت جب مرغ بانگ دیتا ہے تو دوسرے گاؤں والے سنتے ہیں، اس طرح یہ آواز سو فرسنگ تک سنائی دیتی ہے، زابج میں ایک عجیب رسم ہے، بادشاہ کا محل ایک جھیل سے ملا ہوا ہے، اس میں روز صبح کو بادشاہ سونے کی اینٹ پھینکتا ہے، جو پانی میں چھپ جاتی ہے لیکن جوار بھاٹے میں صاف نظر آتی ہے، جب بادشاہ مرتا ہے، تو یہ اینٹیں باہر نکالی جاتی ہیں، جو گن اور تول کر سرکاری دفتر میں درج کر دی جاتی ہیں، اس کے بعد شاہی خاندان کے افراد، عہدیداروں اور ملازموں میں تقسیم ہو جاتی

ہیں، کچھ غربا کو بھی دیئے جاتے ہیں،

مسعودی نے بھی اپنی کتاب مروج الذہب میں کچھ تفصیلات دی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ چین اور سیراف اور عمان کے بندرگاہوں کے درمیان براہ راست بحری سفر ہوتا تھا، اور ان دونوں ملکوں کے تجارتی جہاز کے ملنے کی جگہ کالاہ تھی کہیں کی خلیج میں مہاراجہ کی حکومت ہے، جس کی سلطنت کے حدود غیر محدود ہیں، جتنے جزیرے اس کے پاس ہیں، ان کا سفر ایک تیز رو جہاز دو سال میں بھی نہیں ختم کر سکتا ہے، مہاراجہ کی سلطنت میں ہر قسم کے مسالے اور خوشبوئیں پائی جاتی ہیں، دنیا کا کوئی حکمران اپنی سلطنت کی زمین سے اتنی زیادہ دولت حاصل نہیں کرتا ہے، اسکے پاس لاتعداد فوج بھی ہے،

ان تفصیلات کے باوجود اب تک یہ پتہ نہیں چلا ہے، کہ سلینڈرا کی حکومت کا دارالسلطنت زابج کہاں پر واقع تھا، کچھ سال پہلے سماترا کی سرودجیا کی سلطنت زابج کی جائے وقوع بھی بتائی جاتی تھی لیکن ابوزید حسن کے بیان سے اسکی تردید ہوتی ہے، کیونکہ وہ زابج کے جزیرہ کا تذکرہ کرکے لکھتا ہے، کہ بادشاہ جن جزیروں پر حکومت کرتا ہے، ان میں ایک سری بزہ بھی ہے، اس سری بزہ سے بلاشک وشبہہ سری جیوا مراد ہے، مگر میرا ذاتی خیال ہے، کہ سلینڈرا کا پایہ تخت جزیرہ نما ملایا میں ہوگا، جب سلینڈرا نے اپنی حکومت ملایا میں قائم کی تو یہ خطہ کلنگ یا کلنگا کے نام سے موسوم ہوگیا، جاوا میں سلینڈرا کے کچھ کتبے پائے گئے ہیں، جن کے حروف، مقامی حروف سے بالکل مختلف ہیں، بلکہ یہ بنگال اور بہار کے پالا کتبے سے ملتے جلتے ہیں، یہاں پر یہ بات بھی معلوم کرنے کی ہے، کہ سیلا اُد سیلودبھوا کے نام سے چند خاندان بنگال، بہار اور اڑیسہ میں حکمراں رہے ہیں، اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ سلینڈرا کلنگا یا اسکے آس پاس کے حصے سے باہر گئے، اور شاید ہندوستان کے کسی شاہی خاندان سے ان کا نسبی لگاؤ تھا، بعض محققوں کا یہ خیال ہے کہ برما میں جو تلائنگ واقع ہے، وہ کالنگا یا تلنگانہ ہی سے منسوب ہے، جہاں سے لوگ یہاں آئے، تلائنگ کا نام شاید تری کالنگا سے ماخوذ ہو، جو

کالنکا کے پچھم جانب پہاڑی خط ہے، اگر یہ قیاس صحیح ہے، تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ سلینڈرا پہلے زیرین برما کی طرف گئے، اور پھر ملایا پہونچے، یہ بظاہر قیاسات ہیں، لیکن اون کے ذریعہ تحقیق کی راہیں صاف ہو جانے کی امید ہے، اس تحقیق سے پتہ چلے گا، کہ برما اور مشرق بعید میں ہندوستانی تہذیب و تمدن کہان تک پھیلا، ڈاکٹر کوئڈس نے بھی خیال کیا ہے، کہ شاید کمبوڈیا میں فونن کے حکمران سلینڈرا ہی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہون،

خاندان سلینڈرا کے بادشاہوں کا سیاسی تعلق مشرق میں چینی شاہنشاہوں اور مغرب میں ہندوستانی بادشاہون سے برابر قائم رہا، چینی تاریخوں میں سلینڈرا کے یہان سے کم از کم دس شاہی قاصدوں کے آنے کا ذکر ہے، وہان سے تجارتی جہاز بھی برابر آتے رہتے تھے،

سلینڈرا بودھ مذہب کے پیرو تھے، وہ مذہبی کتبے گوڈیا بنگال سے منگواتے تھے، جاوا میں ایک کتبہ مورخہ ۷۸۲ء پایا گیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے، کہ سلینڈرا خاندان کا گرو گوڈا سے آیا، نالندہ (بہار) کے ایک کتبہ سے یہ معلوم ہوا کہ سلینڈرا خاندان کے ایک بادشاہ بالاپتر دیو نے یہان ایک خانقاہ بنوائی، اسکی خواہش کے مطابق پالا کے بادشاہ یا بنگال کے دیوپال نے راج گرہا (یعنی راجگیر) کے علاقہ میں اس کے اخراجات اور مرمت وغیرہ کے لئے پانچ گاؤن وقف کر دیے تھے، نالندہ کی کھدائی کے سلسلہ مین کچھ پیتل کی مورتیں بھی نکلی ہیں، جو جاوا کی صنعت سے ملتی جلتی ہین، یہ شاید اسی خانقاہ کے ساتھ ملحق ہوں، کیونکہ سلینڈرا کے زمانہ میں نالندہ نے ملایا کے آرٹ اور مذہبی تحریکون پر نمایاں اثر ڈالا تھا،

سلینڈرا بادشاہوں کے دوستانہ مراسم جنوبی ہند کے چولا حکمرانوں کے ساتھ بھی تھے، لیڈن میں ایک تانبے کی تختی محفوظ ہے، اس کے کتبے سے ظاہر ہوتا ہے، کہ سلینڈرا خاندان کے بادشاہ کوداما نی ورمن نے ناگاپٹن (یعنی مدراس کے علاقہ نگاپٹم) میں ایک خانقاہ تعمیر کرائی، جو کہ کوداما نی ورمن

وی ہارا کے نام سے مشہور تھی، چولا خاندان کے راجہ راجا نے اپنی حکومت کے اکیسوین سال میں اس خانقاہ کیلئے ایک گاؤں وقف کیا، ان دونوں خاندانوں کے درمیان تجارتی تعلقات بھی قائم تھے، تامل زبان کی ایک پرانی نظم میں ذکر ہے، کہ کالاگام سے کاویری کے دہانہ پر چولا کے بندرگاہ میں مال واسباب آیا کرتے تھے، یہ کالاگام سلینڈرا کا دار السلطنت تھا، جس کو چولا کادارام اور عرب تاجر کالا کہتے تھے،

لیکن چولا اور سلینڈرا کے دوستانہ تعلقات بہت زمانہ تک قائم نہ رہ سکے، چولا خاندان کے پرانے کاغذات سے پتہ چلتا ہے، کہ اس خاندان کا شہنشاہ راجندر چولا سلینڈرا کے حکمران سنگ رام وجے تونگا ورمن پر غالب آیا، اول الذکر نے سمندر پار بہت سے ملکوں کو فتح کیا، ایک عرصۂ دراز تک ہندوستان کے مورخ ان ملکوں کی جائے وقوع ہندوستان کے اندر ہی بتایا کرتے تھے، حالانکہ چولا کے کاغذات میں یہ بات صریحاً لکھی ہے، کہ راجندر چولا نے سمندر پار ملکوں کو فتح کرنے کے لئے بہت سے جہاز روانہ کئے، بعض مورخون نے ان ملکوں کو پیگو (برما) کے اندر واقع ہونا بتایا ہے، اسمتھ نے بھی اپنی تاریخ ہندوستان میں اس کی حمایت کی ہے، لیکن اسمیں شک کرنیکی مطلق گنجایش نہیں ہے کہ یہ ممالک سماترا میں اور ملایا میں سلینڈرا کی سلطنت کے اجزاء تھے، اور انہی کو چولا راجندر نے فتح کیا،

چولا اور سلینڈرا سے مخاصمت کے اسباب نہیں معلوم ہو سکے ہیں، لیکن شاید تجارتی رقابت سبب ہو، سلینڈرا کی سلطنت ایک ایسے مقام پر واقع تھی، جہاں سے یہ مغربی اور مشرقی ایشیا کی بحری تجارتوں پر پورا اقتدار رکھتی تھی، معلوم ہوتا ہے، کہ چولا کے حکمراں بھی ایشیا کی بحری تجارتون پر یہی اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے، چنانچہ دونوں کی جنگ قریب قریب نصف صدی تک قائم رہی، راجندر اور اس کے دو جانشینون نے سلینڈرا کے بادشاہوں پر فتح پائی، لیکن اتنی دور دراز مملکت کو اپنے قبضہ میں رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا، خصوصاً جب چولا سلطنت میں اندرونی اختلال

شروع ہوا، آخر میں وہ اپنے بحری مقبوضات سے باز آئے، اس کے بعد سلینڈرا اور چولا میں دوستانہ مراسم قائم ہوگئے، لیڈن میں جو کتبہ مورخہ ۱۰۹۰ء محفوظ ہے، اس سے پتہ چلتا ہے، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، کہ سلینڈرا کے ایک بادشاہ کی خواہش پر چولا کے بعض حکمرانوں نے نالندہ میں سلینڈرا کے بادشاہ کی بنائی ہوئی خانقاہ کے لئے ایک گاؤں وقف کر دیا،

لیکن چولا کے حملوں کے بعد سلینڈرا کے حکمرانوں کا اقتدار کم ہوگیا، گو انھوں نے اپنی سلطنت کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی، مگر اس کے بعد جو خاندان حکمران ہوئے ان کے نام معاصر تاریخوں اور دستاویزوں میں نہیں ملتے، چینی مورخ ان کو پرانے نام ہی کے ساتھ یاد کرتے ہیں، لنکا کی تاریخوں میں جاوا کا اور زابج مترادف سمجھے جاتے ہیں، یہ سلطنت تین سو برس اور قائم رہی لیکن یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے، کہ اس مدت میں سلینڈرا ہی حکومت کرتے رہے، چینی کتاب چوفان چی میں ذکر ہے کہ تیرہوین صدی میں اس سلطنت میں سماترا اور ملایا شامل تھے، لنکا کی تاریخ کولاوانی سا سے معلوم ہوتا ہے، کہ تیرہوین صدی کے وسط میں جاوا کا کے بادشاہ کندر بجانو نے لنکا پر دو حملے کئے، پہلے میں پورے لنکا پر قبضہ کر لیا، لیکن دوسرے میں مغلوب ہوا اور خزانہ اور اہل و عیال کو میدانِ جنگ میں چھوڑ کر فرار ہو گیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حملہ کی وجہ سے کندر بجانو کو جنوب کے پانڈیا حکمرانوں سے بھی لڑنا پڑا، ایک کتبہ مورخہ ۱۲۶۴ء سے پتہ چلتا ہے کہ جت ورمن ویرا پانڈیا نے ساوکیے کے بادشاہ کو شکست دی، اس ساوکیے سے جاوکیا ہی مراد ہوگا، جاوا کے فرمانرواؤں نے اس سلطنت کے اختلال سے فائدہ اٹھایا، اس پر پے در پے حملے کئے، جس سے یہ عظیم الشان سلطنت جس کو ہندوستانیوں نے قائم کیا تھا چھ سو سال کے بعد نیست و نابود ہو گئی، اب سے پانچسو سال قبل یہ سلطنت ختم ہوئی اور اسکی یاد بھی بھلا دی گئی ہے لیکن جزیرہ جاوا کا جدید نام کا لنکا اسکی شوکت کو تازہ کرتا ہے، اسکے علاوہ اس کے فرمانرواؤں نے جاوا کی

تہذیب اور تمدن پر اپنا نمایاں اثر چھوڑا، انکی بعض تعمیری یادگارین بھی اب تک قائم ہین،

سلینڈرا بودھ مذہب کے فرقہ مہایانہ کے پیرو تھے، جب ان کی حکومت قائم ہوئی، تو سماترا اور جاوا میں بودھ مذہب اور اس کے فلسفہ کی ترویج ہوئی، اوپر کہا جا چکا ہو کہ سلینڈرا کے شاہی خاندان کا ایک پروہت بنگال سے آیا تھا چنانچہ اسی زمانہ میں تنتروں کے نظریات بھی پھیلے (تنتر اسنسکرت کی مقدس کتابیں ہیں، جن میں زیادہ تر سحر و نیر نجات کا ذکر ہے) اور ان پر بعض کتابیں بھی لکھی گئیں، مثلاً سانگ ہیانگ کما ہیانی کان شاید سلینڈرا کے زمانہ ہی کی تصنیف ہے،

بودھ مذہب کی ترویج سے اس جزیرہ کے آرٹ پر بھی اثر پڑا، اور وہاں کا شہرۂ آفاق مندر بار بدار ہندی جاوی آرٹ کا بہترین نمونہ ہے، اس کے علاوہ اور بہت سے مندر ہیں، مثلاً کانڈی کالاسان، کانڈی ساری، کانڈی مندت اور کانڈی پاوان، جو اسی مخلوط آرٹ کے مظاہر ہیں، نبرات اور سنگ تراشی کے بعض نمونے تو ہندوستان سے زیادہ بہتر ہین،

اس سلطنت کے شروع عہد کے جو کتبے پائے گئے ہیں انکے حروف تہجی تو بالکل ہندوستانی ہین لیکن رفتہ رفتہ بالکل مختلف ہوگئے، اسی طرح یہاں کے آرٹ کے بعض نمونے اپنی ہیئت، ساخت اور فن مین بالکل ہندوستانی ہیں، چنانچہ ہندوستان کے ازمنہ وسطیٰ کے آرٹ کا ہر نمونہ وہاں ملیگا، لیکن گیارہویں اور بارہویں صدی سے وہاں کے ملکی اثرات کا استیلا شروع ہوگیا، یہانتک کہ وہاں کا آرٹ خالصۃً دیسی ہوگیا، اسکے اسباب تلاش کرنیکی ضرورت نہیں، ہندوستانی جب ملایا پہنچے تو اپنی تہذیب اور تمدن سے یہاں کے ملکی باشندوں کو متاثر کرتے رہے، اور یہ اثرات اسوقت تک قائم رہے جبتک کہ ہندوستان سے ہندوستانیوں کی آمد جاری رہی لیکن یہ آمد آخر بند ہوگئی، اور رفتہ رفتہ ہندوستانی یہاں کے ملکی باشندوں سے اسطرح گھل مل گئے کہ انکی قومیت اور اصلیت کا بھی پتہ چلانا مشکل ہو گیا، اسوقت وہاں ڈچ حکمراں ہیں، سلینڈرا کی طرح انکی حکومت بھی ختم ہو گئی، تو وہ شکر اور ربڑ کی کاشت کی یاد کے سوا کچھ اور نہ چھوڑ جائیں گے، لیکن بار ابدر اور دوسری سیکڑوں یادگارین ہزاروں برس تک سلینڈرا کی یاد تازہ کرنے کے لئے کافی ہیں،

"ص ع"

اخبار علمیہ

اسپرنٹو کی تجدید کی کوشش

اسپرنٹو ایک مصنوعی بین الاقوامی زبان کا نام ہے، جسکو پولینڈ کے ایک ماہر طب لے زار ولوڈوی کو زامنہوف نے ۱۸۸۷ء میں ایجاد کیا تھا، اس کے وطن میں روسی، پولش، جرمن اور یہودی آباد تھے جو الگ الگ زبانیں بولا کرتے تھے، مختلف بولیوں کی مشکلات کو دور کرنے کے لئے زامنہوف نے اس مشترکہ زبان کو اختراع کیا، اس میں اس نے یورپ کی مختلف زبانوں کے الفاظ کے مادوں سے الفاظ بنائے، مگر اس میں مادوں کی تعداد کم سے کم رکھی ہے، اسکے لغت میں کل ۲۶۴۲ مادے ہیں، اسی طرح صرف و نحو کے کل سولہ قاعدے ہیں،

ابتدا میں یہ زبان تجارت اور بین الاقوامی سیاست کے لئے مفید سمجھی گئی تھی، چنانچہ ۱۹۰۱ء تک یورپ کے مختلف حصوں میں استعمال ہونے لگی تھی، لیکن اساسی انگریزی (Basic English) کی ترویج اور مقبولیت کی وجہ سے یہ زیادہ پھیل نہ سکی، پھر بھی یورپ کے مختلف حصوں میں اس کے بولنے والوں کی تعداد پندرہ لاکھ ہے، ہالینڈ اور سویڈن میں یہ زبان کثرت سے مستعمل ہے، اب تک اس میں چار ہزار کتابیں اور رسالے نکل چکے ہیں، سویڈن سے تو اس زبان میں ایک رسالہ بھی برابر نکل رہا ہے، اور وہاں اسکے حامیوں کی تعداد بھی کافی ہے، ابھی چند مہینے ہوئے، کہ لندن میں اسپرنٹو کی بین الاقوامی لیگ کا ایک جلسہ ہوا جس میں چالیس

مختلف قومیتوں کے چودہ سو نمایندے شریک ہوئے تھے، گذشتہ چار سال سے یہ زبان بہت زیادہ خطرہ میں آگئی ہے، چنانچہ مذکورہ بالا جلسہ کا انعقاد اسی غرض سے ہوا تھا، کہ اس زبان کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے، اس جلسہ کی منجملہ اور تجاویز کے ایک تجویز یہ ہے کہ لندن اور اس کے مضافات میں اس زبان کے مدرس شبینہ جاری کئے جائیں، اور فرانس کے تمام سرکاری مدارس میں اس کی تعلیم دیجائے، معلوم نہیں اس قسم کی کوششیں اسکی اشاعت کے لئے کہاں تک مفید اور بارآور ثابت ہوں گی،

نفس اجتماعی کا ایک نیا نظریہ

جب کسی جہاز میں آگ لگ جاتی ہے، تو اس کے سب مسافر دریا میں کود پڑتے ہیں، کسی کارخانے میں ہڑتال ہوتی ہے، تو ہڑتالی پولیس پر حملہ کر بیٹھتے ہیں، ان کی موٹروں کو الٹ دیتے ہیں، ایک مجمع میں کچھ لڑکے چیختے ہیں، تو سب چلا اٹھتے ہیں، کیوں؟ ماہرین نفسیات اس کا سبب نفس اجتماعی بتاتے ہیں، اسکی خصوصیت یہ ہے کہ ایک فرد کے کردار سے دوسرا ضرور متاثر ہو جاتا ہے، یہ ناممکن ہے کہ جماعت کے اندر ایک فرد کچھ کرے، اور دوسرا اسکی تقلید نہ کرے، اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے جرمن ماہرین مابعد الطبیعیات نے اسکی وجہ نفس اجتماعی ہی قرار دی ہے، مگر جرمنی کے سیاسی مدبرون نے اسکو قابل قبول نہیں سمجھا، ولیم میکڈوگل نفس اجتماعی ہی کا حامی ہے، مگر بعض عمرانی ماہرین نفسیات بھی نفس اجتماعی کو سائنٹفک اصول کی بنا پر غلط اور لغو قرار دیتے ہین، ان کا خیال ہے، کہ ایک جماعت یا مجمع میں ہر فرد کا کردار بالکل الگ اور مختلف ہوتا ہے، اپنی نئی کتاب "کردار اجتماع" میں اسٹینفورڈ یونیورسٹی کا عمرانیات کا استاد ڈاکٹر رچرڈ ٹراسی لاپیرے مذکورہ بالا دونوں نظریوں کو صحیح نہیں سمجھتا ہے، اس کا خیال ہے کہ افراد کے کردار اور معاشرتی تفاعل کے نمونے مختلف ہوتے ہیں، لیکن اجتماع کے کردار کے لئے موخر الذکر کو قابل غور قرار دینا چاہیے،

اسی لئے وہ کردار اجتماع کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتا ہے، مثلاً اداری، تقلیدی، فوجی، رسمی (جس میں شادی، غم، فوجی تنظیم اور چال چلن شامل ہیں) تفریحی، سیاسی، معاشی، قانونی وغیرہ اسی طرح اس نے ایسے کردار کی بھی تقسیم کی ہے، جو دہشت زندی تعصب اور سرکشی سے پیدا ہوتے ہیں، اس تقسیم کے بعد ڈاکٹر ہیرے ان کی اصلیت نوعیت اور فعلیت پر بحث کرتا ہے، اور ان میں شرکت کرنے والوں اور ان کی تخیل پرستی (Ideology) کی تشریح کرتا ہے، ڈاکٹر موصوف کا خیال ہو کہ تخیل پرستی ہی کردار کا اصلی سبب ہوتی ہے اس لئے کسی اجتماع کے افعال بھی افراد کے منفرد خیالات کی بنا پر ظہور پذیر ہوتے ہیں،

سرطان کا علاج

سرطان کا زخم لاعلاج سمجھا جاتا ہے لیکن امریکہ کی ییل یونیورسٹی میں کچھ ایسے تجربے ہوئے ہیں، کہ اس مایوسی میں کچھ امید پیدا ہو چلی ہے، وہاں کے ایک ماہر حیاتیات نے سرطان میں مبتلا چوہوں کو ونٹر گرین (Winter-green) کا تیل پلایا، اس سے اس کا مرض جاتا رہا اس تیل کے اجزا میں الڈی ہائڈ ہے یہ ایک بے رنگ طیران پذیر مائع ہے جو الکحل پر آکسیجن کے اثر سے پیدا ہوتا ہے) یہ سرطان کے ورم کو دور کرنے میں مفید ثابت ہوا ہے، وہاں کے دوسرے ماہرین فن نے بھی اس کا تجربہ شروع کر دیا ہے، انھوں نے الڈی ہائڈ کے انجکشن دس ایسے کتوں کو دیئے جو سرطان میں مبتلا تھے، تو کتوں کا مرض جاتا رہا، عضویاتی طور پر انسان اور کتے ملتے جلتے ہیں، اس لئے یہ تجربہ انسان کے سرطان میں بھی کامیاب ہو سکتا ہے لیکن ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ابھی غیر ماہرین اس سے تجربہ نہ کریں، جب تک اس تیل کے اجزاء ترکیبی اور اس کے اثرات کی کافی تحقیق نہ ہو جائے، کسی قطعی نتیجہ پر پہونچنا قبل از وقت اور مضرت رساں ہے،

"ص ع"

مطبوعات جدیدہ

رسالہ دینیات حصہ دہم مولفہ مولینا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی تقطیع اوسط ضخامت ۱۵۸ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت اوسط قیمت ۹ ر پتہ:۔ دفتر ترجمان القرآن نزد پٹھان کوٹ پنجاب

حیدرآباد کی مجلس نصاب کتب نے طلبہ کے لئے دینیات کا جو مفید سلسلہ تالیف کرایا ہے یہ اس کا دسواں حصہ ہے، یوں تو دینیات کے متعدد سلسلے ہیں، جو مذہبی معلومات کے لئے کافی ہیں لیکن ضرورت اسکی تھی، کہ اسلامی عقائد وتعلیمات کو جدید مذاق کے مطابق اس انداز میں پیش کیا جائے کہ ہماری نئی نسلوں کے دلوں میں بھی گھر کر سکیں، اس رسالہ میں اس کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے، اور اسلام، ایمان، اطاعت، نبوت، اسکی حقیقت وضرورت، نبوت محمدی، ایمان مفصل کے تمام اجزاء، عبادت کی حقیقت، اسلامی عبادات، دین وشریعت، اس کے احکام واصول حقوق اللہ، اور حقوق العباد وغیرہ اسلام کے تمام ضروری عقائد وتعلیمات کو ایسے دلنشیں طریقہ سے پیش کیا گیا ہے، اور اس کے مصالح اور حکمتوں کی ایسی دلپذیر تشریح کی گئی ہو کہ مذہب کو محض عقل کی میزان میں تولنے والا بھی بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا، اور ٹھیٹھ عقیدہ کا دامن بھی کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے، یہ رسالہ اگرچہ مسلمان طلبہ کے لئے لکھا گیا ہے لیکن طلبہ اور غیر طلبہ اور مسلم اور غیر مسلم سب کے مطالعہ کے لائق ہے،

توضیح الکلام، مؤلفہ جناب ابوعبیدہ نظام الدین صاحب بی اے سائنس ماسٹر اسلامیہ ہائی اسکول کوہاٹ، تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۵ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت عہ، علاوہ محصول ڈاک، غالباً مصنف سے ملیگی،

قادیانیوں کے گمان میں مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کے ثبوت کا دار و مدار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے ثبوت پر ہے، اس لئے قادیانیوں اور اہل سنت کے مناظروں میں یہ ایک معرکۃ الآرا مبحث بن گیا ہے، اور اس پر معلوم نہیں کتنی کتابیں لکھی جاچکی ہیں، مذکورۂ بالا کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس میں مؤلف نے حیاتِ مسیحؑ پر انجیل، کلام اللہ، احادیثِ نبویؐ، اقوالِ صحابہؓ، اور اقوالِ ائمہ مفسرین سے سیکڑوں ثبوت اسناد اور دلائل پیش کئے ہیں، آخر میں خود مرزا صاحب اور متعدد قادیانی اکابر کے اقوال سے بھی اس کا ثبوت مہیا کیا ہے، اس بحث میں ان اقوال و اسناد کے علاوہ اور بہت سی مفید علمی بحثیں آگئی ہیں، اس قسم کے مباحث و دلائل، مناظرہ کی بہت سی کتابوں میں ہیں جناب ابوعبیدہ صاحب کی یہ محنت لائقِ تعریف ہے، کہ انھوں نے ان سب کو اس کتاب میں جمع کردیا ہے، ان کی کثرت کا اندازہ کتاب کی ضخامت سے ہو سکتا ہے، کہ صرف ایک بحث پر ساڑھے تین سو صفحے صرف کئے گئے ہیں، مناظرہ سے ذوق رکھنے والوں کے لئے اس کتاب میں کافی معلومات ہیں، چند شرائط کے ساتھ اس کتاب کے جواب لکھنے والے کو ایک ہزار انعام کا بھی اعلان ہے، اور یہ بھی قادیانی طریقہ استدلال کا گران قیمت جواب ہے،

یادگارِ سلف، مولفہ جناب مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی تقطیع بڑی ضخامت ۷۰، صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲؍، پتہ:- مصنف مدرسۃ الاصلاح سرائمیر ضلع اعظم گڈھ سے ملیگی،

حضرت مولانا سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی اولادِ امجاد میں مولانا سید محمد امین صاحب نصیر آبادی عالم کے ایک صاحبِ علم و عمل اور جامعِ شریعت و طریقت بزرگ تھے، اتباعِ سنت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان کا طغرائے امتیاز تھا، ان کے ایک مخلص مرید مولوی نجم الدین صاحب اصلاحی نے "یادگارِ سلف" کے نام سے ان کی سیرت تالیف فرمائی ہے، اس میں حضرت سید صاحب کے خاندانی حالات، تعلیم و تربیت، علمی کمالات، درس و تدریس، مواعظ و نصائح، بیعت و ارشاد، اتباعِ سنت، انکارِ بدعات

تصانیف اور اخلاق و شمائل کے حالات ہیں، اور اخلاق و شمائل کو مذہبی تعلیمات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، اس لئے یہ کتاب سوانح کے ساتھ مذہبی زندگی کا لائحۂ عمل بن گئی ہے، اور اس میں بہت سے مفید مذہبی معلومات آگئے ہیں، با صفا مرید کی عقیدت و شیفتگی کتاب کی سطر سطر سے نمایان ہے، امید ہے کہ یہ مفید کتاب سید صاحبؒ کے مریدوں میں خصوصیت کے ساتھ زیادہ مقبول ہوگی،

دلی کی دو سو برس کی تاریخ مولفہ مولوی سید حسن صاحب برنی، ایم اے ایل ایل بی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۵ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ:- مکتبہ جامعہ دہلی،

سید حسن صاحب برنی تیمور کے حملہ سے قبل کی دلی کے آثار و تمدن کی ایک مبسوط تاریخ لکھ رہے ہیں، اس کے بعض ابواب کا خلاصہ انھوں نے جامعہ میں بطور مقالہ پڑھا تھا، جسے مکتبہ جامعہ نے کتابی شکل میں شائع کردیا ہے، برنی صاحب نے مقالہ کے شروع میں خود لکھدیا ہے، کہ "اس مختصر مقالہ میں دو سو برس کی ابتدائی تاریخ کا احاطہ ناممکن ہے، اور اس کے تمام شواہد و اسناد کا حوالہ اور ان کی جانچ پرتال دشوار ہے، اس لئے اس میں صرف طائرانہ نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے" اس لئے علمی نقطۂ نظر سے اس ناتمام ٹکڑے پر تنقید قبل از وقت ہے، اصل کتاب کی اشاعت کے بعد اس کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے، بہرحال یہ مختصر رسالہ بھی مفید معلومات سے خالی نہیں ہے، اس میں دلی کی پرانی تاریخ، اس کے آثار، ہندوستانی اور اسلامی طرزِ تعمیر کی خصوصیات اور ان سے ایک دوسرے کا استفادہ، پرانی تاریخوں اور سفرناموں سے دلی کی مٹی ہوئی عمارتوں اور تیمور سے پہلے کے موجودہ آثار کا سرسری ذکر ہے،

سیدچین شائع کردہ جناب مالک رام صاحب ایم اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸؍، پتہ مکتبہ جامعہ دہلی،

مرزا غالب نے اپنے فارسی کلیات کی اشاعت کے بعد "سبد چین" کے نام سے اپنے اس کلام کو ایک مختصر مجموعہ شائع کیا تھا، جو کلیات میں اشاعت سے رہ گیا تھا، یا اسکی اشاعت کے بعد کہا گیا تھا، ان کی وفات کے بعد کلیات کے جتنے اڈیشن چھپے، ان میں سے کسی میں یہ مجموعہ شامل نہ ہو سکا اور اب یہ قریب قریب نایاب ہے، جناب مالک رام صاحب ایم اے نے جنکو غالب اور کلامِ غالب سے خاص دلچسپی ہے، اس "گوہر نایاب" کو مولینا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے "گنج گرانمایہ" سے حاصل کرکے شائع کیا تھا، جو بہت جلد فروخت ہو گیا، یہ اس کا دوسرا اڈیشن ہے، اس میں "۹ قصائد" "ایک ترکیب بند" "ایک ترجیع بند" "ایک چند شعری مثنوی" "پچاس قطعات" "ایک نظم" "۲۰ غزلیں" "۲۰ رباعیات" اور کچھ متفرق اشعار ہیں، غالب کے فارسی کلام کے قدردانوں کے لئے یہ قابلِ قدر تحفہ ہے،

ڈائنگ ٹیچر، مؤلفہ ماسٹر محمد عروج حسین صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت اوسط قیمت ۱۲؍ پتہ منیر آباد حیدر آباد دکن،

رنگ سازی ہمیشہ سے فن رہی ہے، اب اس نے اور ترقی کرکے علمی فن کی حیثیت حاصل کرلی ہے، دوسری زبانوں میں اس پر مستقل کتابیں ہیں، ماسٹر محمد عروج حسین صاحب ڈائنگ ماسٹر مصنوعات ملکی سرکار عالی نے جنھیں اس فن کا علمی و عملی تجربہ ہے، اس فن پر یہ مفید کتاب تالیف کی ہے، اس میں مختلف قسموں کے رنگ، ان کی ترکیبِ اوزان، اونی سوتی ریشمی کپڑوں کے عام اور خاص رنگ ان کے رنگنے کے اصول و طریقے، وغیرہ رنگ سازی کا پورا نصاب نہایت بسط و شرح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، آخر میں خاص خاص رنگوں کے نسخے، اور ان کے ملنے کے پتے بھی درج کر دیئے گئے ہیں کتاب پیشہ ور رنگ سازوں اور عورتوں کے لئے نہایت کارآمد ہے،

"م"